قصہ ہائے رنگ رنگ
فارسی کی انقلاب انگیز کہانیاں
صمد بہرنگی
مترجم
شعیب اعظمی

قصہ ہائے رنگ رنگ

# قصہ ہائے رنگ رنگ

## فارسی کی انقلاب انگیز کہانیاں

صمد بہرنگی

مترجم
شعیب اعظمی

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

# پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقا کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقا کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت ہند کی جانب سے ترقی اردو بیورو کا قیام عمل میں آیا ہے جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ترقی اردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کر چکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

زیر نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید ہے کہ اردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

# فہرست

بچّوں کے دوست ــ کاظم کے لیے

اور

روح انگیز بھی تاکہ ہمارے لیے اچھے
بچّے تربیت دیں۔ اس امید پر کہ بڑے
ہو کر ان کی زندگی ہم سے بہتر ہوگی۔

(بہرام)

ایران کے فارسی قصے بھی اپنے مقاصد اور موضوع کے لحاظ سے دنیا کے بیشتر ممالک کے قصوں اور کہانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ کہانیاں زبانی اور سینہ بہ سینہ نقل ہوتی ہوئی، مختلف شکلیں اختیار کرتی ہوئی نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگئی ہیں اور ہزارہا سال گذر جانے کے بعد بھی اپنے کردار اور بیان میں نیاپن لیے ہوئے ہیں۔

ان قصوں میں عوامی آرزوئیں، بہادرانہ قربانیاں اور عالمی سچائیاں جلوہ گر ہیں اور ساتھ ہی ریا، ظلم، ناانصافی، فریب، مکر اور خرافات کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ غریبوں، یتیموں اور نادار دلوں کے بارے میں ہمدردی کا عنصر ملتا ہے بلکہ ان کے استحقاق کے لیے مسلسل جدوجہد کا عزم ملتا ہے۔ صدیوں سے مظلوم اور مقہور جنس عورت کے لیے محبت اور عقیدت کی لہر تیز تر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور بچے خواہ کسی طبقے کے ہوں ان کی آرزوئیں اور خواہشات کی قدر کا جذبہ ابھرا ہے۔ امیر، غریب، فقیر، بے نوا، دولت مند، حاجت مند، کسان، مزدور، کاریگر، کارمند، کارشناس قصے اور کہانی کی دنیا میں یکساں ہیں اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ شہری، دیہاتی محل، جھونپڑا، کچا، پکا، سب کچھ ملک کا ہے۔ سب خدا کا دیا ہوا اور بنایا ہوا ہے اور اس کا حق سبھی پر ہے۔ قدیم ایران

کے قصوں اور کہانیوں کا موضوع بن چکا۔

چنانچہ ہر فارسی جاننے والا ایرانی خواہ کسان ہو، چرواہا ہو، اخبار نویس ہو، اداره دار ہو، کھیلن کود تا کھیلتا لڑکا ہو یا ریش دراز بڑے میاں ہوں ظاہر ہے کہ آپ جس ایرانی سے گفتگو کریں گے، ایسی باتیں کرے گا جو علم اور ادب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوں گی۔ طرح طرح کے لطیفوں، قصوں، مثلوں، محاوروں اور اشعار سے مزین اور آراستہ۔ فارسی زبان کے یہ قصے دوسری تمام ادبی اصناف کی طرح ایران میں استفادہ کا ذریعہ ہیں۔

فردوسی نے اپنے "شاہنامہ" میں ایران کی قدیم کہانیاں بھی منظوم کی ہیں اور "رستم و سہراب" کی داستان دنیا بھر میں مشہور ہو چکی ہے۔ ادھر کے پچاس سالوں میں ایران کے متعدد کہانی لکھنے والوں نے ملک گھوم گھوم کر رسالوں کی طرف سے اپیل کرکے گاؤں، قصبوں اور دور دراز پہاڑی علاقوں سے مقامی قصے اور داستانیں منگوا کر ترتیب دیا اور شائع کر دیا ہے۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں کوہی کرمانی نے "ایران کے چودہ دیہاتی قصے" کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ معروف ایرانی مصنف صادق ہدایت نے ۱۹۳۱ء میں اس قسم کے قصے اکٹھا کیے اور "آقا دوشہ"، "شنگول و منگول"، "چلک کو چولوی قرقر" اور "سنگ صبور" چھپے بھی اور ریڈیو سے نشر بھی ہوئے۔ صادق ہدایت کی کوششوں کی بدولت ایرانی معاصروں کا ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے ان کی کہانیوں کے مقاصد کو عصری مسائل کا جزو بنا دیا۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی صادق ہدایت کے افسانوں کی سیریز "آب زندگی"، "شیشہ بہار"، "توپ مرواری" اور "قصہ خر دجال" نظیں اور جو کی بود و یکی نبود ...... کے روایتی عنوان سے شروع ہوئیں۔

دوسرے قصہ نویسوں میں صبحی مہتدی نے [illegible] اور [illegible] میں لوک کہانیوں کا بہترین مجموعہ "افسانہ ہای بوعلی سینا" چھاپا۔ [illegible] کے لگ بھگ ناصر خلایار کا نام سنا گیا۔ انھوں نے ملکی قصوں میں حقیقت نگاری کا عنصر زیادہ

کیا: "پسر صیاد"، "دیوان بلخ"، "قصہ پسر تاجر"، "بکلا و شغالون"، ان کے شاہکار ہیں۔

لیکن جدید اور کامیاب ترین قصہ نگاروں کی صف میں صمد بہرنگی کا نام آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس تبریزی مدرس نے اپنے انقلابی قلم سے قصوں کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ افسوس کہ اس ہونہار قصہ نویس کو شاہی عتاب کی زد میں لا کر دریا میں ڈبو کر مار ڈالا گیا۔

احسان یارشاطر کی "داستان ہائے شاہنامہ" اور "داستان ہائے ایران باستان"، "زہرائی خانلری کی "داستان ہائے دل انگیز" ادبیات فارسی" اور افسانہ سیمرغ، مہرداد بہار کی "جمشید شاہ" اور "بستو سم"، امید کی "سیمرغ و سی مرغ" اور خصوصاً مہدی آذر یزدی کی "قصہ ہائے خوب برائے بچہ ہائے خوب" قابل ذکر اور پُرکشش بھی ہیں اور ساتھ ہی امید افزا اور خوش کن بھی۔

صمد بہرنگی نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا شاہکار "ماہی سیاہ کوچولو" اطالوی زبان میں ترجمہ ہو کر "تمغۂ طلائی" کا انعام حاصل کر چکی ہے۔

زیر نظر کتاب "قصہ ہائے بہرنگ" بنام "قصہ ہائے رنگ رنگ" کی گیارہ کہانیاں لوک کہانیوں اور انشائیہ کا نادر نمونہ ہیں۔ بہرنگی نے "اولدوز اور کوّے"، "اولدوز اور بولتی گڑیا" اور "چغندر فروش لڑکا" میں جس سادگی، خواہش، آرزو، توہم اور بچوں کی نفسیات کی جو تصویرکشی کی ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔ "ایک شفتالو ہزار شفتالو"، "سونے جاگنے کے چوبیس گھنٹے" کردار نگاری، منظرکشی اور انشا آمیزی کے کامیاب نمونے ہیں۔ "بڑھیا کا سنہری چوزہ"، "برف کا ڈلہ"، "دیوار پر دو بلیاں" انشا اور کہانی کا خوبصورت امتزاج ہیں۔ "گنجا کبوتر باز"، "دیو اور دو مرد" اور "آخری کہانی" افسانۂ محبت صمد بہرنگی کے ذہن، قلم اور خلاقی کی لازوال نشانی ہیں۔ اولدوز، یاشار، بھیڑی والا، سولماز، لطیف اور توچ علی ایران کے ہی نہیں ساری دنیا کے بچے بچیاں ہیں جو آرزوؤں اور خواہشات کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ سوتیلی ماں، پری خانم، حاجی علی، یارچہ بات، بلغ کالائی اور قیز خانم دنیا کے بدترین انسان ہیں۔ ان سے بہتر بلی، کوّے ہیں، بولتی گڑیا ہے

کبوتر ہے، شغال ہے، طاؤس ہیں جن میں رحم، محبت، بھائی چارہ اور ہمدردی کا جذبہ انسانوں سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ کہانیاں چھوٹے اور بڑے بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ مکمل انسانوں کے لیے بھی ہیں۔ انھیں پڑھیے اور ہمدردی کی روح کو درود و سلام بھیجیے۔

یوں تو فارسی کی لوک کہانیوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن مستشرقین کی دلچسپی نے انھیں عالمی ادب کی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ روسی، جرمن، فرانسیسی اور اطالوی میں ان کے تراجم ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ہیں۔ پاکستان میں کچھ کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ ہندوستان میں اردو میں اس قسم کی پہلی کوشش ہے تاکہ ژوکوفسکی، ماسکوچ، ادیر تلس، روزن فیلڈ اور روس کیسارون جیسے مستشرقین کی روایت کا سلسلہ جاری رہے۔

شعیب اعظمی

# بچوں کا ادب

اب وہ وقت گزر گیا ہے کہ ہم بچوں کے ادب کو خشک نصیحتوں اور بے تجربہ
سوشنوں کی تبلیغ اور تلقین تک محدود کر دیں جسم ہاتھ اور پیر کی صفائی، ماں
باپ کی فرمانبرداری، بزرگوں کا کہنا ماننا، جانوروں کی موجودگی میں شور، جھگڑا
کرنا، صبح اٹھنے کی عادت ڈالو تاکہ کامیاب رہو، مسکراؤ تاکہ لوگ بھی مسکراہٹ
سے جواب دیں، فلاحی اداروں کے طور و طریق، پڑوسیوں کی مدد اور اسی قسم کی
باتیں جن کا تمام تر نتیجہ اپنی زندگی اور سماج کے بڑے اور مشکل مسائل سے
بچوں کو بے خبر رکھنا ہے۔ ہم بچوں کی چھوٹے بچے کو خوشی، شادمانی اور امید
سے دور رکھ کر بند کوٹھری میں اس کے احساسات کا گلا گھونٹ دیں جبکہ وہ کھلی
فضا میں آزادی کا سانس لینا چاہتا ہے۔ بچے کو روایتی اور موروثی کاہل
بنا دینے والے عناصر سے ناامید کر کے پھر سماجی واقعات اور مسائل سے نبرد آزما
ہو جانے کے لیے پُر امید اور بلند حوصلہ بنانا چاہیے۔

کیا یہ صفائی سیکھنے، بزرگوں کا کہنا ماننے اور استاد کی باتیں سننے (کونسا
استادم؟) اور ادب (کونسا ادب؟ وہ ادب جو طاقتوروں، اعلیٰ طبقے کے لوگوں
اور خوشحالوں کا حامی اور اشاعت کرنے والا ہے؟) کے علاوہ کوئی اور دوسری
ضروری چیز سیکھنا ضروری نہیں سمجھتا ہے؟

کیا ہمیں بچے کو یہ نہیں بتانا چاہیے کہ تیرے ملک میں ایسے بچے بھی ہیں

جنھوں نے سالہا سال تک گوشت کا رنگ اور پنیر کا رنگ نہیں دیکھا ہے اس لیے کہ ایک چھوٹے سے طبقہ کا حق جتایا جاتا ہے کہ ان کے دسترخوان پر ہمیشہ بھنی ہوئی بٹیر اور شراب موجود رہے۔

آیا ہمیں بچوں کو یہ نہیں بتانا چاہیے کہ آدھے سے زیادہ لوگ بھوکے ہیں اور کیوں بھوکے ہیں اور بھوک کو ختم کرنے کا علاج کیا ہے؟ کیا ہم بچوں کو انسانی برادری کی کشمکش اور شکست و کامرانی کی تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کریں؟ ہم کیوں بچوں کو صاف، پاکیزہ، بے دماغ، نمائشی اور گمشم بن جانے کی تربیت دیں؟ کیا ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بچوں کو شہر کے اعلیٰ ترین حصے میں شاندار سجائی دکانوں کے شوکیس کی زینت بنا کر تاکہ ہم انہیں خوبصورت گڑیاں تیار کریں۔

ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے؟ ہم چوری کو کیوں بُرا کہتے ہیں؟ ہم کیوں کہتے ہیں کہ والدین کی اطاعت اچھی چیز ہے؟ ہم کیوں نہیں آمادہ ہوتے ہیں کہ چوری، جھوٹ کے رواج، فرق اور رجوع کے اسباب بچوں پر روشن کر دیں؟

ہم بچوں کو سکھاتے ہیں کہ سچ بولنے والے بنیں، جب کہ آج کل وہ زمانہ ہے کہ دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے جھوٹ بولتی ہے اور بھائی بھائی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اگر وہ سچ بول بیٹھے اور کہتا ہے زبان پر لاوے تو بہت چیزیں تو جانے دیجیے، چند ایک جھگڑوں سے ہی نجات نہیں پائے گا۔

کیا ان نفس پرست اور زرخریدہ ماں باپ استادوں کی فرمانبرداری ایک اچھا کام ہے کہ جن کا مقصد زندگی گزارنا ہے اور جتنا ممکن ہو سکے پیسہ حاصل کرنا ہے!

ہم کیوں غریبوں کی مدد کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی نصیحتیں بتاتے کہ کیوں وہ آدمی فقیر بن گیا اور یہ دوسرا امیر؟ جو سینہ پھلا کر آگے آئے اور اپنی بے حساب دولت کا ایک بہت سا حصہ اس فقیر کو دے اور اپنے سر کا احسان اتارے کہاں ہاں میں سخی اور غمخوار دل والا انسان ہوں اور ہمیشہ تجھ جیسے مغلوب

اور بدنصیبوں کی دستگیری کرتا ہوں۔ لیکن نیکی بھی اللہ کی خوشنودی کے
لیے ہے ورنہ تو تو آدمی کہلائے جانے کے لائق بھی نہیں ہے۔"

اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم بچوں کے ادبیات میں دو خاص چیزوں پر
توجہ کریں اور اصولی طور پر ان دونوں کو اپنے مقصد کی بنیاد بنائیں۔

پہلی بات تو یہ کہ بچوں کے ادب کو، بچوں کی رنگین اور بے خبر دنیا اور
بچپن کے سنہرے خواب و خیال، اور بزرگوں کے سماجی تلخ اور دردانگیز ماحول
میں ڈوبی ہوئی بے خبر دنیا کے درمیان ایک پل کی طرح ہونا چاہیے۔ بچے کو
چاہیے کہ وہ اس پل پر سے گزرے اور ہاتھوں میں چراغ لیے ہوئے باخبر
اور مسلح ہو کر بڑوں کی اندھیری دنیا میں داخل ہو۔ یہ بھی شکل ہوگی جب
بچہ زندگی میں اپنے باپ کا حقیقی مددگار اور معاون بن سکتا ہے اور بڑا ہو جا کر
اور بگڑے ہوئے معاشرہ میں تبدیلی لانے والا مثبت رول ادا کر سکتا ہے۔

چاہیے کہ بچہ یہ جانے کہ اس کا باپ کتنی مشقت کے بعد روٹی کا ایک لقمہ
کماتا ہے اور اس کا بڑا بھائی کتنے ظلم برداشت کرکے ہاتھ پیر مارتا ہے اور
تنگ ہو چکا ہے۔ اس بچے کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا باپ کس طرح اپنا
پریشان کن اور تکلیف دہ دنوں اور سخت جاڑوں میں زندگی گزارنے کے
لیے دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ بچوں کو کمزور اور ناامید کرنے والے مناظر
سے ناامید کرنا چاہیے۔

بچوں کو چاہیے کہ ان کے والدین بھی اس محدود اور اتھاہ پانی میں ڈوبے
ہوئے سوائے ہاتھ پیر مارنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے ہیں اور جیسا کہ سارے
بچے غلط اندازہ کرتے ہیں ان کے والدین کبھی بھی اپنی ذمہ داریوں کو نہیں
نبھا پاتے ہیں اور ان کا بس صرف ان کی عورتوں پر چلتا ہے۔

خلاصہ کلام اور دوسری بات یہ کہ بچے کو دنیا کو غور سے دیکھنے کی
تعلیم دینا چاہیے۔ اُسے ایسا ترازو دینا چاہیے جس میں وہ سماج اور اخلاق
کے قسم قسم کے مسئلوں کا اندازہ ہمیشہ کے بدلتے ہوئے معاشرتی حالات اور
واقعات کی نوعیت پر کر سکے اور پرکھ کر اس کی قدر و قیمت سمجھ سکے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ اخلاقی مسائل ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ جو کچھ ایک سال پہلے اچھا تھا ممکن ہے دو سال بعد برا ہو جائے۔ جو کام کسی ایک قوم یا طبقہ میں اخلاقی اقدار کا حامل ہے بہت ممکن ہے دوسری ملت اور گروہ میں اخلاق کے منافی شمار کیا جاتا ہے۔

اس ایک خاندان میں جہاں باپ خاندان کی ساری آمدنی کو اپنے عیاشی اور مستی میں خرچ کر ڈالے اور معاشرہ میں تبدیلی اور تغیر کا کوئی نشان نہ ہو اور پھر سماجی تبدیلیوں کی راہ میں رکاوٹ ہو تو پھر بچہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ سچ بولنے والا، فرمانبردار اور بغیر شور و ہنگامہ والا ہو اور اپنے باپ کے عقیدوں اور خیالات کو اسی طرح قبول کرے۔

بچوں کے ادب کو بھی اخلاق کی طرح صرف قناعت، خاکساری اور دوستی کی قسم کی چیزوں کی تبلیغ نہیں کرنی چاہیے، بچے سے کہنا چاہیے کہ ہر اس چیز کو جو کہ انسانیت کے مخالف، غیر انسانی اور سوسائٹی کے تاریخی ارتقا میں رکاوٹ بن رہی ہو، اس کا مخالف ہو جائے اور اس نفرت اور غصہ کو بچوں کے ادبیات میں نمایاں کیا جانا چاہیے۔

فرمانبرداری اور دوستی کی تبلیغ صرف ان لوگوں کی طرف سے جن کے حصہ میں ترازو کا بھاری پلڑا ہے، یقیناً غیر فطری امر نہیں ہے، لیکن ان لوگوں کے لیے بھی یہ چیزیں قیمتی نہیں ہیں جن کے ہاتھ میں میزان کا خالی اور ہلکا پلڑا ہے۔"

صمد بہرنگی

# چند باتیں

بچو! بے شک مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے اور اس کا برا اور اچھا بھی
تمہاری چیز ہے۔ تم چاہو نہ چاہو بڑے ضرور ہو گے اور اپنے زمانہ کے ساتھ
ساتھ آگے جاؤ گے۔ اپنے بزرگوں اور باپ دادا کے پیچھے آرہے ہو اور ان کی
جگہ لو گے اور تمام چیزیں حاصل کرو گے اور اجتماعی زندگی کی تمام اچھائیوں
کے مالک ہو گے۔ غریبی، ظلم، زبردستی، انصاف، خوشی، رنج، مجبوری، مار کام
اور بے کاری، جیل خانہ اور آزادی، مرض اور علاج، بھوک، ننگے پیر اور
سیکڑوں اجتماعی خوشیاں اور محرومیاں تمہارے حصہ میں آئیں گی۔

ہم جانتے ہیں کہ دکھ درد کے علاج کا پہلے پہل سبب جاننا چاہیے۔ مثلاً ڈاکٹر
اپنے مریضوں کے علاج کے لیے پہلے مرض کے جراثیم کا پتہ لگاتے ہیں پھر ان مریضوں
کو جراثیم کش دوائیں دیتے ہیں۔ اپنی سماجی زندگی کے درمیان بہت سی تکلیفوں
کے علاج کے لیے ہمیں بھی کام کرنا چاہیے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ صحت مند جسم میں
بیماری کبھی نہیں ہوتی پھر ایک اچھے سماج میں بھی ناخوشی اور بیماری کا نام و
نشان نہیں ہونا چاہیے۔ رسہ کشی، بڑائی، مار، ناجائز چوری چکاری اور لڑائی بھی
بیماریاں ہیں جو صرف بیمار سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں۔ ان تمام محرومیوں کے
علاج کے لیے ہم ان کی وجہ معلوم کریں۔ تم ہمیشہ اپنے آپ سے سوال کرو کہ کیوں
میرے ہم جماعت کو قالین بننے کے کارخانہ بھیج دیا گیا! کیوں چند لڑکے چوری

کرتے ہیں؟ کیوں یہاں اور وہاں لڑائی اور خوں ریزی ہو رہی ہے؟ مرنے کے بعد ہم کیا بن جائیں گا؟ پیدا ہونے سے پہلے میں کیا کر رہا ہوں؟ اور دنیا آخر کار کیا ہو جائے گی؟ جنگ، غریبی اور بھوک کون سے دن ختم ہوگی؟

اور اس طرح اپنے آپ سے ہزاروں سوال کرنا چاہیے تاکہ تم سماج اور اس کی تکلیفوں کو سمجھ پاؤ۔ یہ بھی جانو کہ سماج صرف تمھارے گھر کی چار دیواری نہیں ہے۔ سماج ہر وہ علاقہ ہے جہاں ہمارے ہم وطن بھائی زندگی گزارتے ہیں۔ ہر دور دراز گاؤں سے بڑے اور چھوٹے شہروں تک۔ گاؤں کے کیچڑ بھرے بے ہنگم راستوں سے شہر کی شاندار سڑکوں تک، گاؤں کے غریبوں کی اندھیری کھولیوں سے بنی گندی جھونپڑیوں سے لے کر دولت مند شہریوں کی اونچی اور جگمگاتی کوٹھیوں تک، کسانوں اور قالین بافوں کے مزدور بچے پرانے کپڑے پہنے ہوئے بچوں سے لے کر ان بچوں تک جن کی کھانے کی غذا مرغا، پنیر، بریانی، کیلا اور نارنگی ہے، یہ سب سماج ہے۔ جو تمھیں اپنے بزرگوں سے میراث کے طور پر ملے گا۔ تمھیں نہیں چاہیے کہ اپنے بزرگوں سے پائی ہوئی میراث بغیر چھوئے ہوئے اپنی آئندہ نسل کو سپرد کر دو۔ تم کو چاہیے کہ برائیاں کم کر دو یا ان کو ختم کر دو۔ اچھائیوں کو بڑھاؤ اور دکھ درد کا علاج معلوم کرو۔ انھیں نیست و نابود کر دو۔ سماج وہ امانت نہیں ہے جو جوں کا توں محفوظ رکھ لیا جاتا ہے۔

سماج کو پہچاننے اور سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے کچھ راستے موجود ہیں۔ ان راستوں میں سے ایک یہ ہے کہ گاؤں اور شہروں کا سفر کرو اور مختلف قسم کے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہو۔ دوسرا راستہ کتابوں کا مطالعہ ہے۔ لیکن ہر کتاب نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہر کتاب کا ایک بار پڑھنا بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ یہ بات احمقانہ ہے۔ دنیا میں ہم اتنی اچھی کتابیں رکھتے ہیں کہ ہماری تمام زندگی اس کے آدھے کا آدھا بھی پڑھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ کتابوں میں سے ہمیں اچھی سے اچھی کتاب تلاش کر لینا چاہیے۔ وہ کتابیں انتخاب کریں جو ہمارے قسم قسم کے سوالوں کا جواب

دے سکیں۔ ہمیں دوسرے ملکوں اور قوموں کے سماج کے بارے میں بتائیں،
چیزوں کے اسباب، حادثات اور واقعات کی تفصیل بتائیں جن سے سماجی
نامرادیوں کو واقف کرائیں۔ وہ کتابیں جو ہمیں جنت بالآخر بتاتی ہیں اور وضو کا
دیں صرف پھاڑ کر پھینک دینے والی اور جلا ڈالنے کے لائق ہیں۔

بچے قصے اور کہانیوں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ بامقصد کہانیاں ہم
لوگوں کو عوام، سماج، اور زندگی سے واقف کرائیں گی اور ان کی جدوجہد
کی تفصیل بتائیں گی۔ کہانی پڑھنا صرف وقت گزارنا نہیں ہے اس لیے میں
بھی نہیں چاہتا ہوں کہ سمجھدار بچے میری کہانیوں کو صرف دلچسپی کے لیے
پڑھیں۔

بہرنگ

# کچھ صمد بہرنگی کے بارے میں

صمد بہرنگی جنوبی ایران کے شہر تبریز کے ایک قصبہ چرنداب میں ۱۹۳۹ء
میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں آذربائیجان کے مختلف قصبات میں مدرس
مقرر ہوئے اور گیارہ سال تک ، ممقان ، قدجہان ، آذرشہر ، گوگان اور
آخیرجان میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۸ء میں حکومت کے عتاب کا شکار ہوکر
دریا برد کیے گئے۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے کے علاوہ جو کہ دنیا کے بچوں کے ادبیات
کی اہم پونجی ہیں اور دوسرے مضامین بھی لکھے ہیں۔

ان کے تعلیمی مضامین کے مجموعے کتابی صورت میں "ایران کے تعلیمی
مسائل میں جد و جہد" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ آذربائیجان کی لوک کہانیوں
کو جمع کرنے میں بہرنگی کی ان تھک کوشش بھی خاطرات کی شکل میں تین
جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

اپنے دور کے فارسی شعراء کا کلام جو انھوں نے آذری زبان میں منتقل
کیا ہے، ترکی زبان پر مہارت اور عبور کا بین ثبوت ہیں۔ اسی بنا پر ایک
ایرانی ادیب کا یہ کہنا ہے کہ بہرام کی زندگی اس کا شاہکار تھی۔

# اولدوز کے بارے میں چند باتیں

بچو! سلام! میرا نام اولدوز ہے فارسی میں اس کا مطلب ستارہ ہوتا ہے۔ اس سال میرے دس برس پورے ہو گئے۔ جو قصہ کہ تم پڑھ رہے ہو میری زندگی کی کہانی کا ایک حصہ ہے۔ جناب بہرنگ ایک زمانہ میں ہمارے گاؤں کے استاد تھے۔ ہمارے گھر میں ٹھہرے تھے۔ ایک دن میں نے اپنی کہانی انھیں سنائی بہرنگ صاحب کو یہ کہانی بہت اچھی لگی اور بولے اگر تم اجازت دو تو میں تمھاری اور کوّوں کی کہانی بنا کر کتاب لکھ دوں۔ میں نے منظور کر لیا لیکن چند شرطوں کے ساتھ پہلی یہ کہ میری کہانی صرف بچوں کے لیے لکھیے اس لیے کہ بڑی عمروں کے لوگ جو اس قدر باخبر ہوتے ہیں کہ وہ میری کہانی نہیں سمجھیں گے اور مزہ نہیں پائیں گے دوسری یہ کہ میری کہانی ان بچوں کے لیے لکھیے جو یا تو غریب ہوں یا پھر بڑے چاؤ کے بچوں سے جلتے ہوں۔ بس یہ ہے میری کہانی پڑھنے کے حقدار نہیں ہیں! وہ بچے کیا جو اپنے نوکروں کے ساتھ مدرسہ آتے ہیں یا جو بچے شاندار کاروں میں سوار ہو کر مدرسہ آتے ہیں۔ بہرنگ صاحب بتاتے تھے کہ بڑے شہروں میں امیر بچے ایسا ہی کرتے ہیں اور بہت سے بچے اس پر فخر کرتے ہیں۔

بہر حال میں کہتا ہوں کہ میں سات سال کی عمر تک اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ تھا۔ یہ کہانی اسی زمانہ کی ہے۔ میری ماں گاؤں میں تھیں۔ والد نے ان کو طلاق دے دی تھی۔

انھیں نانی کے پاس بھیج دیا تھا اور دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ ایک دفتر میں کام کرتے تھے۔ اس وقت ہم لوگ شہر میں رہتے تھے وہ ایک چھوٹا شہر تھا مثلاً صرف ایک سڑک پر شہر تھا۔ چند سالوں کے بعد میں بھی گاؤں چلی گئی۔

جو کچھ کو بہرنگ صاحب نے زبان دی تھی کہ اس کے بعد میری بولتی گڑیا کا قصہ لکھیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ میری کہانی سے بہت سی چیزیں سیکھ لیں گے۔

آپ کی دوست

اولدوز

# اولدوز اور کوے

اولدوز کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی تنہا اور اکیلی۔ باہر دیکھ رہی تھی سوتیلی ماں حمام میں نہانے گئی تھی دروازہ میں تالا لگا گئی تھی۔ اولدوز سے کہہ گئی تھی کہ اپنی جگہ سے نہ ہلے گی، ورنہ آکر مارتے مارتے باپ کی یاد دلا دے گی۔ اولدوز کمرے میں بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی بالکل بڑی عمر کے مانند سوچ رہی تھی اور ہل نہیں رہی تھی۔ ماں سے بہت ڈرتی تھی اپنی بڑی گڑیا کے بارے میں فکر مند تھی۔ گڑیا پرانی ہو گئی تھی اس کا دل اتنا لگیں تھا کہ کہا نہیں جا سکتا کئی بار اس نے اپنی انگلیوں پر کچھ گنا اور پھر آہستہ سے کھڑکی کے پاس آئی۔ اس کا جو ملا ختم ہو گیا تھا یکایک دیکھا کہ پانی کے حوض کے کنارے ایک کالا کوا بیٹھا ہوا پانی پی رہا ہے۔ اس کی تنہائی غائب ہو گئی اور دل خوش ہو گیا۔ کوے نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس کی نگاہیں اولدوز کی طرف اٹھیں۔ چاہا کہ اڑ جائے مگر جب دیکھا کہ اولدوز اس سے مطلب نہیں رکھتی ہے تو نہیں اڑا۔ اپنی چونچ تھوڑی سی کھولی۔ اولدوز نے سوچا کہ کوا ہنسنا چاہتا ہے۔ خوش ہو گئی اس سے بولی، کوے صاحب حوض کا پانی گندہ ہے اگر پیو گے مریض ہو جاؤ گے۔

کوا زور دار ہنسا۔ پھر کودا اور اولدوز کے سامنے آکر بولا نہیں عزیزم ہم کوؤں کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ہم اس سے زیادہ خراب بھی پیتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اور ایک بات یہ کہ مجھ کو کوے جناب نہ کہو۔ میں مادہ ہوں اور چار عدد بچے بھی ہیں۔ مجھ کو بی کوی کہو۔

اولدوز نہیں سمجھی کہ کوا کس طرح سے بادام ہے اتنا مہربان تھا اگر اولدوز چاہتی تھی کہ اسے پکڑ لے اور چوم لے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کوا خوبصورت نہیں تھا بد صورت بھی تھا لیکن نرم دل تھا اگر تھوڑا سا بھی آگے آ جاتا تو اولدوز اسے پکڑ لیتی اور چوم لیتی۔

بی کوّی پھر بھی تھوڑا آگے آئیں اور پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟

اولدوز نے اپنا نام بتایا۔ پھر بی کوّی نے پوچھا۔ تم کیا کام کر رہی ہو؟

اولدوز بولی کچھ بھی نہیں۔ میری سوتیلی ماں مجھے چھوڑ کر نہانے گئی ہے اور کہا ہے میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں۔

بی کوّی بولیں۔ تم تو بالکل بڑی عمر کے لوگوں کی طرح سوچ رہی ہو۔ کھیلتی کیوں نہیں؟ اولدوز کو اپنی بڑی گڑیا یاد آ گئی۔ ایک آہ بھری۔ بعد میں کھڑکی کو کھولا تاکہ اس کی آواز باہر پہنچ جائے اور بولی۔ بی کوّی اگر میرے پاس اور کوئی چیز نہیں کہ کھیلوں میرے پاس ایک بڑی گڑیا تھی ....... بولتی گڑیا ......

بی کوّی نے اپنے بازو کی نوک سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھے، اڑان بھری اور کھڑکی کے بالکل سر پر آن بیٹھی۔ اولدوز پہلے تو ڈری اور پیچھے ہٹ گئی بعد میں اسے اس قدر خوش ہوگئی کہ پوچھو نہیں اور سامنے آئی۔ بی کوّی نے کہا۔ گڑیا اور ساتھ کھیلنے والی بھی چاہیں۔

اولدوز نے کہا ہاں شاید ہے لیکن اب میں اسے کم دیکھ پاتی ہوں بہت کم مدرسہ جاتا ہے۔

بی کوّی نے کہا: تو ہم دونوں کھیلیں۔

اولدوز نے بی کوّی کو گود میں لے لیا اس کا سر اور چہرہ چوما اس کے پر سخت تھے۔ بی کوّی نے اپنے پیر سکوڑ لیے تھے تاکہ اولدوز کا لباس گندہ نہ ہو جائے۔ اولدوز نے اس کی چونچ کو بھی بوسہ دیا اس کی چونچ سے صابن کی بو آ رہی تھی۔

بولی بی کوّی تم کو صابن بہت پسند ہے کیا؟

بی کوّی بولیں۔ میں تو صابن کے پیچھے جان دیتی ہوں!

اولدوز نے کہا۔ میری سوتیلی ماں حمام گئی ورنہ میں ایک صابن کا ٹکڑا تمہارے لیے لے آتی۔

بی کوتی نے عاجزی سے کہا: چھپا کر لاؤ تمہاری ماں کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔

اولدوز بولی: تم اس سے جا کر کہو گی تو نہیں؟

بی کوتی نے جواب دیا: نہیں! میں کسی کی چغلی نہیں کھاتی ہوں۔

اولدوز نے کہا: میری سوتیلی ماں تو کہتی ہے، تم جو کام بھی کرو گی کوا آکر مجھے بتا دے گا۔ بی کوتی زور سے ہنسی اور بولی: جھوٹ کہتی ہے میری پیاری بچی میرے اس کالے سر کی قسم میں کسی کی چغلی نہیں کھاتی۔ میں پانی پینے کا بہانہ کر کے حوض کے کنارے آتی ہوں پھر صابن اٹھا کر چپکے سے چلی جاتی ہوں۔

اولدوز بولی: بی کوتی چوری کیوں؟ یہ تو گناہ ہے۔

کوتی بولی: ہاں، تو میری پیاری بچی گناہ کیا ہے؟ یہ گناہ ہے کہ میں چوری نہ کروں میں خود اور میرے بچے بھوک سے مر جائیں گے۔ یہ گناہ ہے۔ میری عزیزہ گناہ یہ ہے کہ میں اپنا پیٹ نہ بھر سکوں۔ گناہ یہ ہے کہ صابن بیری روتے پھینکا جائے اور میں بھوکی رہوں۔ میں اب اتنی عمر کی ہو گئی ہوں کہ ان چیزوں کو جان سکوں۔ یہ تم بھی جان لو کہ ان بے جان اور خالی خولی نصیحتوں سے چوری نہیں روکی جا سکتی ہے۔ جب تک ہر آدمی اپنے لیے کام کرتا رہے گا چوری بھی ہوتی رہے گی۔

اولدوز نے چاہا کہ جائے اور صابن کی ایک ٹکیہ کوتی کے لیے لے آئے۔ سوتیلی ماں کھانے پینے کی چیزوں کو نعمت خانہ میں رکھتی تھی اور تالا ڈال دیتی تھی لیکن صابن کو نہیں چھپاتی تھی۔ بی کوتی کو کھڑکی کے پاس چھوڑا اور خود الماری کے پاس گئی۔ مراغہ کا بنا ہوا ایک صابن اٹھا کر لے آئی۔

"پھوٹ تمہاری آنکھیں پھر سے دن نہ دیکھیں۔" اولدوز نے دیکھا کہ جیسے ہی بی کوتی گئیں سوتیلی ماں بھی چلی ہی آ رہی تھی۔ چلانے کے ساتھ ان کی عقل بھی روبی ہو رہی تھی اس کا چہرہ بھی چقندر کی طرح سرخ تھا۔ اولدوز عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ سوتیلی ماں نے اپنا سر کھڑکی میں ڈالا اور آواز لگائی۔ اولدوز اب پھر کیا ہوا جو گھر کو الٹ پلٹ کر رکھا ہے؟ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ ہلنا نہیں، اوہ؟

اولدوز کچھ نہیں بولی۔ ماں اندر آنے کے لیے دروازہ کا تالا کھولنے لگی۔ اولدوز نے جلدی سے صابن کو کپڑے کے نیچے چھپا لیا اور ایک کونے میں سمٹ گئی۔ ماں اندر

آئی اور بولی بتایا نہیں کس چیز کی تلاش میں گھوم رہی تھی۔

اولدوز نے اچانک کہا: ماں مجھے نہ مار میں اپنی بڑی گڑیا کی تلاش میں جا رہی تھی سوتیلی ماں کو اولدوز کی گڑیا بہت بری لگتی تھی۔ اولدوز کا کان پکڑا اور اینٹھا۔ اور بولی سو بار کہا ہے کہ اپنی منحوس گڑیا کا خیال اپنے دماغ سے نکال دے تو سمجھی؟

اس کے بعد ماں چلی گئی اور الماری کے پیچھے چلئے دم کرنے کا انتظام کرنے لگی اولدوز نے بہانہ بنایا اور صحن میں چلی آئی۔ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی دیکھا کہ بی کوّی کوٹھے پر براجمان ہیں اور اس کی آنکھیں منتظر ہیں۔ صابن لے گئی اور رکھ دیا پیڑ کے نیچے کنکھیوں سے بی کوّی کو اشارہ کیا کہ اپنا صابن لے جا بی کوّی ہتانی آہستہ سے نیچے آئیں اور پیڑ کے نیچے ٹھہریں۔ اولدوز نے اس سے پوچھا کوّی رانی اپنے بچوں میں سے ایک کو میرے پاس لاؤ گی کہ میرے ساتھ کھیلے۔

بی کوّی نے چیں چیں کرتے ہوئے کہا۔ دن کا کھانا کھا کر میرا انتظار کرنا اگر میرے میاں بھی راضی ہو گئے تو لاتی ہوں۔

پھر اپنا صابن اٹھایا پر سکوڑے اور چلی گئی۔

اولدوز نے اپنی آنکھیں آسمان میں گڑو رکھی تھیں جس وقت کوّی دور ہو گئی خوشی سے اچھلنا کودنا شروع کر دیا معلوم ہوتا تھا اپنی گم شدہ بولتی گڑیا پا گئی ہو ایک سوتیلی ماں نے آواز دی۔ لڑکی کس لیے ناچ رہی ہے۔ اندر آ مجھے پتی کری چڑھی ہوتی ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں کہ تیری خدمت کروں۔

دن کے کھانا کھانے کا وقت تھا اولدوز کمرے کے اندر جا کر بیٹھ گئی چند منٹ کے بعد اس کے باپ دفتر سے آ گئے۔ کھانسے کھنکھارے اور اولدوز کے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ ہاتھ دھوئے دسترخوان پر بیٹھ گیا اور کھانا شروع کر دیا گویا آج دفتر کے افسر سے بک بک جھک جھک ہو گئی تھی۔

اولدوز جلے ہوئے آلوؤں کی مہک سے بیہوش ہو جانا چاہتی تھی اپنے باپ کا کھانا دیکھ رہی تھی اور اپنا تھوک گھونٹے جا رہی تھی کوئی چیز اٹھا کر کھانا نہیں چاہتی تھی۔ سوتیلی ماں ہمیشہ کہتی تھی بچے کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اپنی مرضی سے لے لے بڑوں کو چاہیے کہ بچوں کے برتن میں کھانا نکال دے تب وہ کھائیں۔

## کوّے جناب سے ملیے

ستمبر کا مہینہ تھا۔ سب دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ باپ اور ماں کو نیند آ رہی تھی اور وہ قیلولہ کر رہے تھے۔ اولدوز بھی سونے کے لیے مجبور تھی ورنہ بابا اس کا سر کھا جاتے۔ وہ کہتا تھا کہ بچوں کو چاہیے کہ دن کا کھانا کھائے اور سو جائے۔ اولدوز کبھی بھی یہ نہیں جان سکی تھی کہ کیوں ضرور سو جانا چاہیے۔ اپنے آپ سے کہتی تھی آج تو میں سو نہیں سکتی ہوں۔ اگر سو جاؤں تو بی کوّی آئیں گی مجھے نہیں پائیں گی اور بچہ دوبارہ لے جائیں گی۔

کمرے کے فرش پر لیٹ گئی اور جان بوجھ کر سوتی بنی۔ جب باپ اور ماں سو گئے دبے پاؤں باہر آئی اور شہتوت کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ تیسی بار اپنی انگلیوں پر گنتی کی کہ کوّے صاحب آ گئے۔ پہلے کوٹھے پر بیٹھے اور اولدوز کی طرف دیکھا۔ اولدوز نے اشارہ کیا کہ نیچے آ سکتا ہے۔ بی کوّی آ کے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ایک چھوٹا کوّا بچہ بھی اپنے ساتھ لائیں تھیں بولیں: مجھے ڈر تھا تم سو گئی ہو۔

اولدوز نے کہا: میں ہر روز سو جاتی تھی۔ آج میں نے ماما اور بابا کو سلا دیا اور خود نہیں سوئی۔

بی کوّی نے کہا: شاباش اچھا کام کیا۔ سونے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ اگر دن میں سوؤں گی تو رات میں کیا کام کروں گی؟

اولدوز بولی: یہ بات سوتیلی ماں سے کہنا۔ ننھے کوّے کو میرے لیے لائی ہو۔ کتنا پیارا ہے!

کوّی نے کوّے کو اولدوز کے ہاتھوں میں دے دیا۔ بہت پیار کرنے کے قابل تھا۔ اچانک اولدوز نے ٹھنڈی سانس بھری۔ کوّی نے کہا: کیوں ٹھنڈی سانس لی۔ اولدوز بولی: میری اپنی گڑیا یاد آ گئی۔ کاش میرے پاس ہوتی ہم تینوں کھیلتے۔ کوّی نے کہا اس کا غم نہ کرو۔ میری ہمسائیوں میں سے بڑی والی انڈا دینے ہی والی ہے اور بچے نکلیں گے ان میں سے ایک تمھارے لیے لاؤں گی پھر تم تین ہو جاؤ گے۔

اولدوز بولی: مگر کیا اب تمھارے پاس دوسرا بچہ نہیں ہے؟

کوٹی نے جواب دیا: کیوں نہیں ابھی بھی اور بھی ہیں
اولدوز نے کہا میں لا کے لے آؤں۔
کوٹی بولی: اس وقت میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ کوؤں کا باپ بھی ہے اجازت نہیں
دے گا۔ یہ بھی ہے میں تمہارے لیے لاؤں۔ ابھی زبان نہیں کھولی ہے۔ چلتا ہے
لیکن اڑنا نہیں جانتا ہے۔ ایک ہفتے میں بولنا شروع کر دے گا اور آئندہ ہفتے
میں اڑ سکے گا تو پھر رہ جا کر دوسرے ہفتے تک اڑنے لگے ورنہ پھر کبھی دوبارہ
پر نہ کھول سکے گا تمہیں یاد رہے۔
اولدوز نے پوچھا: اگر پر نہ کھول سکا تو پھر؟
کوٹی بولی: تمہیں معلوم ہے پھر مر جائے گا۔ کیا نا جانتے تھے اسے کیا دو گے
اولدوز نے جواب دیا: نہیں میں نہیں جانتی۔
کوٹی نے بتایا: ہر روز ایک صابن کا ٹکڑا، تھوڑا گوشت اور اسی طرح
کی کوئی چیز اگر ہو سکے تو ایک چھوٹی مچھلی، تم اپنے حوض میں بہت ساری رکھتی
ہو۔ کیڑے بھی کھاتا ہے اور پنیر بھی۔
اولدوز نے کہا: بہت اچھا۔
کوٹی بولی: تمہاری سوتیلی ماں اسے پالنے کی اجازت دے گی؟
اولدوز نے کہا: نہیں، میری ماں تو انھیں دیکھنا بھی گوارا نہ کرے گی مجھے
اسے چھپا کر رکھنا ہوگا۔
کوٹا اولدوز کے دامن میں بیٹھا مار رہا تھا اپنی چونچ کھولتا تھا آہستہ سے
اس کا ہاتھ پکڑتا اور چھوڑ دیتا اس کی ننھی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ پیر بڑے نازک
تھے بالکل اولدوز کی کانی انگلی کی طرح اس کے پیر کیسے نرم تھے اپنی ماں نے
پروں کی طرح سخت نہ تھے اپنی ماں سے زیادہ خوبصورت بھی تھا۔
کوٹی نے پوچھا: اچھا یہ بتاؤ کہ اسے کہاں چھپاؤ گی؟
اولدوز نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ سوچنے لگی۔ کون سی جگہ ہوگی؟
کوئی جگہ نہیں۔ بولی: میں جھاڑیوں کے اندر چھپا رکھوں گی۔
کوٹی نے کہا: نہیں، تمہاری ماں دیکھ لے گی اس کے علاوہ جب بچوں کو

پانی دے گی میرا بچہ بھیگ جائے گا اور سردی کھا جائے گا۔

اولدوز نے پوچھا پھر اسے کہاں رکھوں؟

کوتی نے ادھر ادھر نظریں ڈالیں اور بولیں۔ سیڑھیوں کے نیچے بہتر ہے زینے کوٹھے کے نیچے ہیں۔ چھوٹے شہروں اور دیہات میں ایسے زینے بہت ہیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کسی پرندہ کا گھونسلہ تھا۔ گھونسلہ کا حصہ چھوڑا تھا۔ کوے کو اس میں ڈال دیا اور اس کا منہ ڈھانپ دیا کہ کہیں بلی آکر اسے پکڑ نہ لے اور ہاں کہ بہت دم گھٹ جائے کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹا سا سوراخ تھا اور کوا اس میں سے سانس لے سکتا تھا

اولدوز نے بی کوتی سے کہا: بی کوتی اس کا نام کیا ہے؟

کوتی نے کہا اسے کوے جناب پکارو۔

اولدوز نے پوچھا: کیا لڑکا ہے؟

بی کوتی: ہاں۔

اولدوز بولی: کہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکا ہے؟ کوے ہمیشہ ایک ہی طرح کے دکھتے ہیں۔

بی کوتی نے بتایا: تم اس طرح سوچ رہی ہو۔ تھوڑا غور کرنا تو سمجھ جاؤ گی کہ لڑکا اور لڑکی فرق رکھتے ہیں ان کا سر اور چہرہ پتہ بتا دیتا ہے۔

تھوڑی بہت ادھر ادھر کی بات کی اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں۔

اولدوز کمرے میں گئی اور لیٹ جانے والی، آنکھیں بند کر لیں۔ جب سوتیلی ماں جاگی تو دیکھا کہ ابھی سوئی ہوئی ہے۔ لیکن اولدوز ذرہ برابر نہیں سوئی ہوئی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کوے جناب کی فکر میں تھی۔ کنکھیوں سے ماں کو دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

## ● مزے دار لڑکے

کچھ دن گزر گئے اولدوز انتہائی خوش اور تر و تازہ ہو گئی تھی۔ بابا اور ماں بہت تعجب کر رہے تھے ایک رات سوتیلی ماں باپ سے کہہ رہی تھی۔ میں نہیں سمجھ پائی کہ کیسی لڑکی ہے ہر وقت ہنستی رہتی ہے اور شرارتیں کرتی رہتی ہے جبکہ بالکل خیال نہیں ہے

مجھے اس کے اس راز کو معلوم کرنا چاہیئے۔

اولدوز نے یہ باتیں سنیں اور اپنے آپ سے بولی: مجھے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے...

روزانہ دو تین بار کوّے جناب کے پاس جاتی۔ کبھی گھر خالی ہوتا تو کوّے کو گھونسلے سے باہر نکالتی اور دونوں کھیلتے رہتے۔ اولدوز اسے بولنا سکھاتی۔ بی کوکی بھی کبھی آجاتیں اور اپنے بچّے کے لیے کوئی چیز لاتی گوشت کی کوئی بوٹی یا اور اسی قسم کی چیزیں ایک بار دو مکڑے لاتی تھی مکڑے کوّے کے گلے میں پھنس گئے تھے اور ہاتھ پیر مار رہے تھے باہر نہیں نکل سکتے تھے کیونکہ ان کے لمبے پیر تھے۔ اولدوز تو ان سے ڈر گئی۔ بی کوکی نے کہا: میری پیاری گڑیا ڈرو نہیں، غور سے دیکھو میرا بچّہ انھیں کس طرح کھاتا ہے۔

کوّے نے بھی بھوک کے ہونے کی وجہ سے انھیں گھونٹ لیا۔ پھر اپنی چونچ کو کئی بار زمین پر گھسا اور بولا: اِکی جان انھیں پھر لاؤ بہت مزیدار تھے۔

اس کی ماں نے کہا: بہت اچھا۔

اولدوز بولی: باورچی خانہ میں بہت سارے ہیں۔ میں تیرے لیے لاؤں گی۔

کوّے نے اپنا حلق گھونٹا اور شکر ادا کیا۔

اس دن کے بعد اولدوز یہاں وہاں پھرتی رہتی اور مکڑوں کا شکار کرتی اپنے کرتے کی جیبوں میں بھر لیتی بٹن بھی گرا دیتی تھی کہ نکل نہ جائیں۔ پھر فرصت پاکر لے جاتی اور کوّے کو کھلاتی لیکن یہ مکڑے اس کی غذا میں شمار نہیں ہوتے تھے یہ تو شکر بٹھائی اور شکر روٹیوں کی جگہ تھے بی کوکی نے کہا تھا کہ اگر اس کو زندہ غذا نہیں دی گئی تو یقیناً مر جائے گا اور پھر اسے کوئی چیز زندہ نہیں رکھ سکے گی کوئی چیز نہیں نگل کر کھاتا۔

ایک روز دن کے کھانے کے وقت سوتیلی ماں نے دیکھا کہ چند لنگڑے لولے مکڑے دسترخوان پر رینگ رہے ہیں۔ اولدوز سمجھ گئی کہ خود اس کی جیب سے باہر نکل گئے ہیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ پہلے چاہا کہ ان کو جمع کرے اور اپنی جیب میں رکھ لے۔ بعد میں خیال کیا کہ جان کر انجان بن جائے۔ ماں نے ان کے پیروں کو پکڑا

اور باہر پھینک دیا اور باہر نکل گئی۔

کھانا کھا کر اولدروز کوے کا حال چال معلوم کرنے گئی تاکہ باقی بچے ہوئے ٹکڑوں کو اسے کھلائے اور ایک دو اور ٹکڑیوں کو اس نے کونوں کھدروں سے پھر سے اکٹھا کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک کو دو انگلیوں سے پکڑ کر کوے کے منہ میں ڈال دیے۔ یہ اس نے بی کوٹی سے سیکھا تھا کہ کس طرح وہ اپنی چونچ سے اپنے بچے کے منہ میں غذا ڈالتی ہے۔

کوا چاہتا تھا کہ ٹکڑی کو کھائے مگر یکایک ٹھٹھک گیا اپنا سر پیچھے کر لیا اور بولا میں نہیں کھاؤں گا اولدروز جان!

اولدروز نے پوچھا: آخر کیوں! میرے ننھے کوے۔

کوے نے کہا: اپنے ناخنوں کو دیکھو کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔

اولدروز نے پوچھا کتنے بڑھے ہوئے ہیں؟

کوا بولا: بہت گندے ہو گئے ہیں، مجھے معاف کرنا اولدروز خاتون۔ میں بکواس کر رہا ہوں۔ لیکن میں وہ کھانا نہیں کھا سکتا.... سمجھی ہو اولدروز خاتون۔

اولدروز بولی: میں سمجھ گئی۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے میری برائی میرے منہ پر کی۔ میں اب خود اپنے ان گندے ہاتھوں سے کھانا نہ کھا سکوں گی یقین کرو:

- مچھلی کے بارے میں جھگڑا
- اور
- کوٹی بی کو پھانسی کا حکم

حوض میں چند سرخ مچھلیاں تیرتی تھیں۔ ساتواں روز تھا کہ اولدروز نے ایک کو پیالے میں پکڑا اور کوے کو کھلا دیا۔ یہ پہلی مچھلی تھی جو وہ کھا رہا تھا۔ اپنی ماں سے سن رکھا تھا کہ مچھلی پکڑنا اور کھونا بہت مزیدار ہوتا ہے لیکن یہ نہیں دیکھا تھا کہ کس طرح۔ اس کی ماں اولدروز کی سوتیلی ماں کی طرح نہ تھی بہت سی چیزیں جانتی تھی۔ سمجھتی تھی کہ کون سی چیز اس کے بچے کے لیے اچھی ہے اور کون سی بری ہے۔ اگر کوا کوئی چیز کھانے کو مانگتا تھا تو اس پر کوئی توجہ نہیں

دیتی تھی کہتی تھی پیارے بیٹے میں یہ تمہارے لیے نہیں لاؤں گی کیونکہ اس
میں فلاں خرابی ہے اور اس لیے کہ اگر تم یہ چیز کھاؤ گے تو ٹھیک سے کھانا کھا ہی نہ
کر سکو گے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ تمہاری آواز پھنس جائے گی اور یوں بھی کہ۔۔
تمام چیزوں کا سبب بتاتی تھی لیکن سوتیلی ماں اس طرح نہ تھی ہمیشہ غصے میں کہتی:
اولدوز یہ کام نہ کر، وہ چیز نہ کھا، اس جگہ نہ جا، کیوں بھنبھنا رہی ہے اور اسی قسم
کی باتیں۔ سوتیلی ماں کبھی نہیں کہتی تھی کہ کیوں چلا چلا کر بولنا نہیں چاہیے، کیوں ظہر
کے بعد سونا چاہیے۔ پہلے تو اولدوز یہ سوچتی تھی کہ تمام مائیں سوتیلی ماں کی طرح
ہوتی ہیں۔ جب بعد میں کوثر کی ماں سے ملاقات ہوئی اور دوست بنیں تو اس کا
خیال بھی بدل گیا۔

سوتیلی ماں نے دوسرے دن جان لیا کہ ایک مچھلی غائب ہے۔ چلانا اور
شور مچانا شروع کر دیا۔ دن کے کھانے کے وقت اپنے شوہر سے بولی، یہ کام
بلی کوّی کا ہے۔ وہی کوّی چور روزانہ آتی ہے اور حوض کے کنارے سے صابن
چراتی ہے۔ بہت ڈھیٹ بھی ہے اگر ہاتھ آ جائے تو سولی پر چڑھا دوں گی اور
پھانسی دے دوں گی۔

کوّی بی کو بڑی بڑی گالیاں بھی دیں۔ اولدوز کی آواز بھی نہیں نکلتی تھی مگر
نہ کچھ کہتی تو ماں سمجھ جاتی کہ وہ بی کوّی سے ساز باز رکھتی ہے۔ خاص طور سے
کہ گذشتہ روز قریب تھا کہ اس کی کلائی پکڑ لے۔

بابا بولا: در اصل کوّے گندے پرندے ہیں۔ اچکے ہیں۔ میں نے اپنی تمام عمر
میں ایک شریف کوّا نہیں دیکھا۔ اس کو نظر میں رکھنا ورنہ وہ حوض کے اندر ایک مچھلی
بھی باقی نہیں چھوڑے گا۔

سوتیلی ماں بولی ہاں ہاں مجھے ہوشیار رہنا چاہیے۔ حالانکہ اب اس نے
مزہ چکھ لیا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہوگا کہ سب کو پکڑ کر کھا جائے۔

اولدوز دل ہی دل میں ماں کی نادانی پر ہنستی کیونکہ کوّوں کے دانت نہیں
ہوتے بی کوّی خود چبا کیسے رہی تھی۔

- بی کوّی بہت سی باتیں جانتی ہیں
- مرنے سے نہیں ڈرتی ہیں

ایک طرح بی کوّی آئیں سب سوچتے تھے دونوں شہتوت کے درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ اولدوز نے ساری باتیں بتا دیں۔

بی کوّی نے کہا: اس کا خیال بھی نہ کرو اگر سوتیلی ماں مجھے پکڑنا بھی چاہے گی تو اس کی آنکھیں نکال لوں گی۔

پھر کوے کو گھونسلے سے باہر لے آئیں اب کوے نے زبان کھول دی تھی اور نہیں تو کیا بالکل اولدوز اور بی کوّی کی طرح نہیں لیکن اچھی حد تک بہت خراب نہیں بولتا تھا تھوڑی دیر پودوں اور جھاڑیوں میں اچھلا کودا ادھر ادھر گیا پھر پر پھڑپھڑائے اور لوٹ آیا اور اپنی ماں کے بغل میں بیٹھ گیا۔ بی کوّی نے اسے بتایا کہ کس طرح جھگڑوں کو اپنی چونچ سے پکڑے اور مارے۔

کوّی اپنے دائیں بازو میں ایک زخم کو دکھاتی تھی۔ اسے اولدوز اور اپنے بچے کو دکھایا اور کہا: اسے پچاس سال پہلے کھایا تھا صابن چرانے گئی تھی صابن بنانے والے نے غلیل چلائی اور مجھے زخمی کر دیا۔ پورے پانچ سال لگے تب جا کر زخم اچھا ہوا۔ کچھ جنگلی پھل کھوج کر کھائے تب کہیں جا کر میں اچھی ہوئی۔

اولدوز بی کوّی کی عقل اور معلومات پر تعجب کر رہی تھی۔ چاہ رہی تھی کہ کاش اس کی ماں بھی ایسی ہی ہوتی۔ اسے خود اپنی ماں یاد نہیں آ رہی تھی صرف ایک بار سوتیلی ماں نے بتایا تھا کہ اس کی بھی ایک ماں ہے۔ ایک بار ماں اور باپ لڑائی کر رہے تھے۔ سوتیلی ماں بولی اس کی بیٹی بھی لے جاؤ اور [illegible] اس کی ماں کے پاس چھوڑ آؤ میں اب اس کی نوکرانی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اسکا [illegible] آج کل میں خود بچہ کی ماں بننے والی ہوں۔

ٹھیک بالکل ٹھیک ہی ہے سوتیلی ماں کا پیٹ بھی آگے نکل آیا تھا اور اس کے بچہ پیدا ہونے کا وقت قریب آ گیا تھا۔

ایک دو بار اس کے چچا نے بھی اس کی ماں کے بارے میں دو ایک باتیں

کی تھیں۔ چچا کبھی کبھی دیہات سے شہر آتے رہتے تھے اور ان لوگوں سے ملنے
آجاتے۔ اولدروز صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کی ماں گاؤں میں رہتی ہے اور اسے
چاہتی ہے اس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ اور نہیں جانتی تھی۔

اس دن کوکی بی نے اولدروز کا چھتہ لے لیا اپنے بچوں کو جو ما پر پھیلاتے اور
کوٹھے پر بیٹھی تاکہ کوؤں کی بستی میں چلی جائے۔ اولدروز نے کہا اپنے بچوں
اور ان کے باپ کو میرا سلام پہونچا دینا۔

بعد میں اسے یاد آیا کہ بچوں کے لیے کوئی تحفہ بھیج دے ایک چوسنی جیب
میں تھی۔ ماں نے اس کے لیے خریدا تھا اسے نکالا اور زینہ طے کر کے چھت پر
گئی چوسنی بی کوکی کو دی کہ بچوں کو دے دے۔ اس وقت کوکی اڑی اور ایک چیڑ کے
درخت کے اوپر بیٹھ گئی۔ اپنا منہ اولدروز کی طرف کیا، کائیں کائیں کیا، اڑی اور
نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

## ● یاشار کی ایک ہلکی جھلک

اولدروز چھت پر کھڑی ہوئی بس اسی طرح چاروں طرف دیکھ رہی
تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ماں کو بغیر بتائے کوٹھے پر آ گئی ہے تھوڑا اور رکی
ایک نگاہ آس پاس کے صحنوں میں ادھر ادھر ڈالی پیچ چھت کے اوپر کتنا
اچھا لگ رہا تھا۔ پڑوس کے صحن میں داہنے جانب نگاہ دوڑائی۔ یہ یاشار کا گھر تھا
یکایک یاشار چپکے چپکے باہر نکلا اور کتے کی کوٹھری کے در پر جا پہونچا جو ہمیشہ
کی طرح خالی تھی۔ یاشار اس سے دو سال زیادہ بڑا تھا ایک تیز اور ہنسی لڑکا تھا
اولدروز نے بہت کوشش کی کہ یاشار اسے دیکھے لیکن وہ ہو سکا، اپنی آواز بھی زور زور
سے نہیں نکال سکتی تھی مایوس ہو گئی تھی کہ یاشار نے اپنا سر اٹھایا اور اسے دیکھا
پہلے حیران ہو گیا پھر خوش خوش دیوار کے نیچے آیا اور بولا تو وہاں کیا کام کر رہی ہے اولدروز؟

اولدروز بولی: میرا دل گھبرا گیا تھا میں نے سوچا کوٹھے پر چلوں اس طرف
اس طرف دیکھوں۔

یاشار بولا: تمھاری سوتیلی ماں کہاں ہے؟

اولدوز تمام باتیں بھول گئی تھی جب یہ سنا تو اسے یاد آیا کہ کوے کو گھر میں چھوڑ آئی ہے، ممکن ہے کہ ماں جاگ جائے اس وقت . . . . ہائے کتنا بُرا ہو جائے گا جلدی سے یاشار سے رخصت ہوئی اور نیچے چلی گئی۔ کوے کو لائی اور گھونسلے میں گھسیڑ دیا۔ اس کا دروازہ بند کر رہی تھی کہ ماں کی آواز سنائی دی: اولدوز کون سی قبر میں جا کر چھپ گئی ہو؟ کیوں بولتی نہیں ہے؟

اولدوز کا دل ڈوب گیا۔ پہلے تو کچھ نہیں کہہ سکی۔ پھر اپنے حواس درست کیے اور بولی: میں یہاں پر ہوں ماں میں پاخانے جا رہی ہوں۔

سوتیلی ماں نے کچھ نہ کہا اور مصیبت بخیر و خوبی ٹل گئی۔

## ● بی کوّی کی پھانسی

دوسری صبح اولدوز بہت سویرے جاگ پڑی۔ بی کوّی کائیں کائیں کرتی جا رہی تھی اور مدد مانگ رہی تھی۔ جیسے کوئی کسی کو قتل کر رہا ہو۔ اولدوز تیزی سے صحن میں دوڑ کر آئی۔ ماں کو دیکھا کہ شہتوت کے درخت کے نیچے کھڑی ہوئی ہے اور کوّی کو درخت سے ٹانگ دیا ہے۔ بے چاری جانور کائیں، کائیں کیے جا رہی تھی۔ ماں اسے لکڑی سے مار رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی ماں کا چہرہ زخمی ہو گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ کوّی پھڑ پھڑا رہی تھی اور کائیں کائیں کرتی جا رہی تھی۔ اپنے پیروں سے بندھی ہوئی لٹک رہی تھی۔

اولدوز کو خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کس وقت سوتیلی ماں کی طرف دوڑ گئی۔ اس کے پیروں کو دونوں ہاتھوں میں دبا لیا اور دانت کاٹ لیا۔ ماں نے زور سے چیخ ماری اور اولدوز سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ ایک زوردار تماچہ اس کے کان کے پاس جڑ دیا۔ اولدوز گر پڑی اور سر پتھروں سے ٹکرا گیا بے ہوش ہو گئی اور پھر کچھ نہ سمجھ سکی۔

## ● اولدوز

اولدوز نے ظہر کے وقت اپنی آنکھ کھولی چند لوگ پڑوسیوں میں سے بھی تھے

ماں اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی جس سے اولدروز کے حلق میں دوا انڈیل رہی
تھی۔ اچانک ایک آنکھ اور ماتھے کو سفید رومال سے باندھے ہوئے تھی بابو اولدروز
کی آنکھیں وحشت سے دیکھ رہی تھیں پھر ایک آدمی کو پہچان گئی۔ یاشار بھی دیکھا
کر اپنی ماں کے پاس کھڑا ہوا تھا اور اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

سوتیلی ماں نے جب دیکھا کہ اولدروز نے اپنی آنکھیں کھولیں، جلدی سے
کہا شکر ہے کہ اپنی آنکھیں کھول دیں اب مرے گی نہیں اولدروز... بات کر۔

اولدروز بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سر ماں کی طرف گھمایا، اچانک بی کوئی
کی کالی بلی کی آواز پھر ہر طرف گونجی۔ اولدروز نے دیوانوں کی طرح سوتیلی ماں
کے بالوں کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور چیخنے لگی لیکن اس کے سر میں اتنا سخت
درد شروع ہو گیا کہ خود بخود اس کا ہاتھ نیچے لٹک گیا اور اس کی آواز بند ہو گئی۔
اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بولی بی کوئی... کہاں ہو... کہاں ہو
بی کوئی کہاں ہو وہ تم کو کھا گیا ہے ہائے کیا ہوا ماں... ماں...

یاشار سب سے پہلے اس کی طرف دوڑا۔ ہر آدمی کوئی نہ کوئی بات کہہ رہا
تھا اور چاہتا تھا اسے چپ کرائے لیکن اولدروز    ہائے ہائے کرتی ہوئی رو
رہی تھی کہتی تھی۔ سوتیلی ماں کہتی تھی پیاری اولدروز رو مت میری جان دوا
کھا لے اور جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

آخرکار اولدروز رو دھو کر چپ ہو گئی اور سو گئی خواب میں دیکھا کہ
بی کوئی توت کے درخت سے لٹکی ہوئی ہے معلوم ہوتا تھا کہ مر رہی ہے اور کہہ رہی
ہے اولدروز میری جان میری باتوں کو بھولنا نہیں ڈرنا نہیں۔ اولدروز درخت کی
طرف دوڑی اچانک ماں درخت کے پیچھے سے آ گئی اور چاہا کہ اولدروز کو
ایک لات مارے اولدروز نے چیخ ماری اور ڈر کر بھاگ گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ
کر رونا شروع کر دیا۔ اب کی بار سوتیلی ماں اور بابا بھی کمرے کے اندر تھے۔ پھر
سو گئی اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی خواب دیکھنے لگی۔ چلائی اور جاگ پڑی۔ رات
تک اسی طرح جاگتی اور سوتی رہی۔ ایک دفعہ آنکھ بھی کھولی اور دیکھا کہ

رات ہے ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا ہے پھر سنا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے بابا سے کہہ رہے ہیں اس کا زخم اہم نہیں ہے جلد ہی اچھا ہو جائیگا لیکن لڑکی ڈر گئی ہے اور چونک جاتی ہے کسی چیز سے بہت ڈر گئی ہے۔ ابھی میں اسے ایک انجکشن لگاتا ہوں، آرام مل جائے گا اور سو جائے گی۔

اولدروز بولی: میں بھوکی ہوں۔۔

ماں اس کے لیے دودھ لے آئی اولدروز نے دودھ پیا۔ ڈاکٹر نے اسے سوتی ٹائی اپنا بیگ اٹھایا اور چل دیا۔

اولدروز چھت کی طرف دیکھ رہی تھی اور کچھ نہیں کہتی تھی چاہتی تھی بابا اور ماں کی باتیں سنے لیکن کچھ زیادہ نہ سن سکی جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

## ● کوے کا دکھ
## اور
## ● بی کوی کس طرح گرفتار ہوئیں

دوسری صبح اولدروز کو کوے کی یاد آئی اس کا ہاتھ کانپ گیا اور لحاف پر چائے گرا دی۔ سوتیلی ماں نے گھور کر دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا۔ بابا جلدی میں تھا اپنا بیشتر پہنا اور ہاتھ اٹھائے فرچاتا تھا اولدروز چاہتی تھی چل کر کوے کے پاس جائے لیکن یہ کام بھی کا نہ تھا کچھ نہیں جانتی تھی کہ بی کوی کس طرح سوتیلی ماں کے ہتھے چڑھ گئی وہ بھی۔ صبح سویرے ماں نے اپنی آنکھ پر بندھا ہوا اور بال کھول دیا تھا بی کوی کی چونچ کا ٹکڑا اس کی کنپٹیوں اور ماتھے پر لگا ہوا تھا۔

جیسے ہی بابا گیا۔ ماں بولی: میں یاشار کی ماں کے پاس جا رہی ہوں۔ جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔ میں نے بہت دنوں سے نہایا بھی نہیں ہے اس بار میں تجھے اپنے ساتھ نہیں لا جا سکی۔ چاہتی ہوں چل کر معلوم کر لوں کہ یاشار کی ماں میرے ساتھ حمام جا سکتی ہے یا نہیں۔

ماں بالکل بہت زیادہ مہربان ہو گئی تھی کبھی اولدروز سے اس طرح

بات نہیں کرتی تھی لیکن اولدروز اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی وہ اسے
بری لگتی تھی ایک بار اس کے دل میں خیال آیا اور بولی ماماں اب جب تم جانے
جارہی ہے یاشار سے بھی کہہ دینا یہاں آجائے۔ میرا اکیلے میں جی گھبرا رہا ہے۔
سوتیلی ماں کی بھنویں تن گئیں پھر بھی بولی: یاشار اپنے مدرسہ جارہا ہے
اولدروز نے کچھ نہیں کہا۔ ماں چلی گئی۔ اولدروز چلی اور کوٹے کا پتہ
معلوم کرنے لگی بیچارہ کوٹا گھونسلہ میں پسر گیا تھا اور رو رہا تھا جب اولدروز
کو دیکھا تو کہا آخر تم آئیں: اولدروز بولی مجھے معاف کریں تمھیں اکیلا چھوڑ گئی۔
کوٹے نے جواب دیا۔ ابھی کوئی چیز لے آؤ کہ میں کھاؤں پھر باتیں کریں
گے میں بہت بھوکا اور بہت پیاسا ہوں۔

اولدروز گئی اور جاکر کھانا پانی لائی کوٹے نے چند لقمے کھائے اور بولا
میں نے سوچا تم بھی میری ماں کے پیچھے گئیں

اولدروز نے پوچھا تمھاری ماں کہاں گئیں!

کوٹے نے کہا کہیں بھی تمھاری ماں نے اسے اس قدر مارا کہ مر گئی بعد
میں اسے کوڑے میں پھینک دیا یا اور کہیں۔

اولدروز نے اپنا رونا چھپا لیا اور بولی: آخر کس لیے اور کیوں؟ اب تو
کتوں نے اسے بوٹی بوٹی کر ڈالا ہوگا اور کھا گئے ہوں گے۔

کوٹا بولا: یہ ٹھیک نہیں ہے آخر ہم کوؤں کا گوشت کڑوا ہوتا ہے کتے تو
ہمت بھی نہیں کرتے کہ ہمارے گوشت کو دانت لگائیں۔ ہمارا مردہ تو
زمین پر اتنے دنوں رہتا ہے کہ سوکھ کر بکھر جائے۔ میری ماں تو کوڑے
دان یا کسی دوسری جگہ پڑی ہوئی سڑ رہی ہوگی۔

اولدروز اپنے آپ کو نہیں روک سکتی تھی رونا شروع کر دیا کوٹا بھی
رو دیا آخر اولدروز بولی: اب سوتیلی ماں آرہی ہوگی ہم کو دیکھے گی میں جا
رہی ہوں جیسے ہی ماں شام گئی میں دوبارہ تیرے پاس آؤں گی۔

اس وقت گھر نکلنے کا در بند کیا اور اپنے لحاف میں لمبی لیٹ گئی ماں آئی
اپنی بچی اٹھائی اور چلی گئی اولدروز اطمینان کے ساتھ اٹھی اور کوٹے کے پاس

بیٹھ گئی۔ خوبصورت دھوپ پھیل گئی تھی۔ کوٹے کو باہر نکالا۔ دروازہ کھول دیا کہ
دھوپ گھونسلے میں چمک جائے۔ کوٹے نے اپنا پر پھڑپھڑایا اپنی چونچ کو دائیں
بائیں رگڑا۔ ٹھیک کہتی ہو اولدوز پیاری۔ آزادی عجیب اچھی چیز ہے۔

اولدوز نے آہ بھری اور بولی تو جانتا ہے کہ بی کوٹی صبح سویرے کس کام
کے لیے آئی تھی؟

کوٹا بولا میں سمجھ گیا۔

اولدوز نے کہا مجھے بھی بتا سکتے ہو؟

کوٹے نے کہا۔ سیاہ گلی میرے پاس آئی تھی کہ مجھے لے جا کر اڑنا سکھائے۔
سورج نکلتے ہی آئی تھی اور کہا آج اڑنے کا دن ہے۔ تیرے بھائی بہنوں
کو لے جا رہی ہوں اڑنا سکھاؤں گی تجھے بھی آنا چاہیے پھر میں تجھے بھی پہنچا
جاؤں گی۔ میں نے اپنی ماں سے کہا اولدوز کہاں ہے؟ اس کو نہیں بتاؤ گی میری
ماں نے جواب دیا میں اس کو خبر کر رہی ہوں۔ ماں نے گھونسلے کا دروازہ بند کیا چاہا
کہ تمہیں جا کر بتائے۔ تو تھوڑی دیر تک نہیں آئی۔ میں گھونسلے میں تھا اچانک
میں نے چیخنے کی آواز سنی۔ میری ماں چیخ رہی تھی کائیں کائیں میرا دل ڈوب گیا میری ماں
کہہ رہی تھی کہ کیا ہم اس شہر میں رہنے کا حق نہیں رکھتے ہیں؟ کیوں ہم کھلم کھلا
اپنی خواہش کے مطابق دوستی نہیں کر سکتے! میں نے روشندان میں سے جھانک کر
دیکھا کہ سوتیلی ماں نے میری ماں کو جالی کے نیچے پھنسا لیا ہے۔ یہ تو معلوم تھا کہ
میری ماں کی باتوں کو نہیں سمجھ پاتی تھی۔

اولدوز بیتاب ہو گئی تھی جلدی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا؟

کوٹا کہنے لگا۔ پھر میری ماں کو رسی میں باندھا اور شہتوت کے درخت سے
لٹکا دیا۔ میری ماں یکایک کودی اور سوتیلی ماں کے چہرے پر اپنی چونچ مار کر زخم
بنا دیا اس وقت تمہاری ماں کمرے سے باہر ہو گئی اور چمٹے سے مارنے لگی۔

اولدوز نے پوچھا کوٹی نے کوئی دوسری بات نہیں کہی۔

کوٹے نے کہا کیوں نہیں کہا کہ اے سوتیلی ماں یہ نہ سمجھنا کہ کوؤں کو چوری
کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اگر میرے پاس کھانے پینے کا سامان ہوتا کہ میں

اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ بھر سکتی تو کیا میں پاگل تھی کہ پھر بھی چوری کرتی اپنا
پیٹ بھر لیتی ہوا اور سمجھتی ہو ساری دنیا تم جیسی ہے ا

کوٹا خاموش ہو گیا۔ پھر ہم باہر آ گئیں۔ ایک کرتا پہنے ہوئے اور باقی جو
کچھ ہوا وہ تم خود جانتی ہو۔

تھوڑی دیر تک دونوں چپ رہے۔ اولدوز نے کہا۔ بس اب تو بی
کوتی گئیں اور معاملہ ختم ہو گیا اب ہم لوگ کیا کریں؟

کوٹا بولا۔ مجھے اڑنا سیکھ لینا چاہیے۔

اولدوز بولی۔ ٹھیک ہے میں خود بھی اس کی فکر میں ہوں۔

کوٹا بولا۔ کاش میرا باپ، بھائی اور بہن اور میری دادی جان جانتے کہ ہم کہاں ہیں۔

اولدوز نے کہا۔ ہاں وہ ہماری مدد کرتے۔

کوٹے نے کہا۔ تمہیں یاد ہے میری اماں کہتی تھی اگر دو چار دن میں میں نے اڑنا
نہ سیکھا تو میں مر جاؤں گا۔

اولدوز نے کہا۔ مجھے یاد ہے۔

کوٹے نے کہا۔ تم اس کا حساب ٹھیک ٹھیک جانتی ہو؟

اولدوز نے اپنی انگلیوں پر حساب کر کے گنا اور بولی۔ ہم صرف چھ روز
سے زیادہ وقت نہیں رکھتے ہیں۔

کوٹے نے کہا۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا کام کرنا چاہیے۔

اولدوز نے کہا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں یاشار کے سپرد کر دوں۔ تجھے
جنگل میں لے جا کر اڑنا سکھائے۔

کوٹے نے پوچھا۔ یاشار کون ہے؟

اولدوز بولی۔ ہمارے بائیں ہاتھ کا پڑوسی

کوٹا بولا اگر اچھا لڑکا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اولدوز نے کہا اچھا تو ہے ہی، ہوشیار اور ذمہ دار بھی ہے۔ لیکن ہم
اسے خبر کس طرح کریں؟

کوٹے نے کہا کیوں نہ کوٹھے پر جاؤ اور دیکھو کہ مجھے اگر لے جائے۔

اولدوز بولی۔ اس وقت نہیں ہو سکے گا۔ وہ مدرسہ گیا ہوگا۔
کوڑے نے پھر کہا مدرسہ؟ لیکن ابھی تو گرمیوں کی چھٹی ختم ہونے میں کئی دن باقی ہیں۔
اولدوز بولی: تم ٹھیک کہتے ہو۔ سوتیلی ماں مجھ سے جھوٹ بولی تھی ورنہ مدرسوں میں تو چھٹی ہے۔ میں چھت پر جاتی ہوں تم یہیں میرا انتظار کرو۔
دوسرے زینہ پر تھی کہ گلی میں پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اولدوز نے جلدی سے کوے کو گھونسلہ میں رکھا، دروازہ بند کیا، کمرے میں گئی، لحاف میں لپٹ کر صحن کی طرف نگاہیں لگا دیں۔

- **ڈر اور خوف**
- **کتے کی مصیبت**

کتے کی بھوں بھوں بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھٹکا یا بابا اندر آیا پھر چچا بھی۔ بابا کے چھوٹے بھائی۔ ایک کالا کتا بھی ان کے پیچھے اندر آگھسا کتے کی زنجیر چچا کے ہاتھ میں تھی۔
بابا بولے: اب کوئی کوا یہاں اپنے پیر نکالنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا
چچا بولے: جیسے ہی جاڑا آئے گا مجھے آکر اسے لے جانا چاہیے۔
بابا نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے۔ جاڑا آتے ہی ہم کو بھی کتا لازم نہ ہوگا
چچا نے کہا! اولدوز کہاں ہے! اپنی ماں کے ساتھ گئی ہے کیا؟
بابا بولے: نہیں بیمار ہے اور سو رہی ہے۔
کتے کی رسی کو شہتوت کے پیڑ سے باندھا اور کمرے میں آگئے۔ اولدوز اپنے چچا کو بہت چاہتی تھی۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس کی ماں کے گاؤں سے آئے تھے۔
چچا نے اولدوز کا حال پوچھا لیکن اس کی ماں کا کچھ حال نہیں پوچھا بابا کو برا لگتا تھا کہ اس کے سامنے اس کی پہلی بیوی کا ذکر ہو۔
چچا نے بابا سے کہا اپنے دفتر نہیں جاؤ گے؟
بابا بولا۔ نہیں میں نے چھٹی لے لی ہے اور وقت بھی ختم ہو گیا۔

اس کے بعد کتوں اور کوّوں کی بات چھڑ گئی۔ بابا کوّوں کو بہت برا کہہ رہا تھا۔ شاید کہتا تھا کہ کوّے گندے اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ آتے ہیں چراتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ کوئی چھت پر یا چیز اٹھانے کے لیے جھکا جلدی ہی چمپت ہو جاتے ہیں۔

دوپہر کا ایک گھنٹہ گزر جانے پر ماں آئی۔ کتا پہلے غرّایا پھر جب چچا نے کھڑکی سے سر نکال کر ڈانٹ پلائی تو چپ ہو گیا۔

ماں چچا سے پردہ کرتی تھی۔ چچا بھی اس کے سامنے اپنا سر نیچے کر لیا کرتے تھے اور کبھی بھی ماں کے چہرے پر اپنی نظریں نہیں ڈالتا تھا۔ اولدوز چپ بیٹھی تھی۔ چچا سے بات نہیں کر رہی تھی۔ اچانک بولی چچا اپنا کتا اپنے ساتھ ہی نہیں لے جا سکتے؟

بابا حیران رہ گیا۔ چچا اولدوز کی طرف پلٹا اور پوچھا کس لیے اسے لے جاؤں؟ اولدوز کی زبان لڑکھڑائی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ بالآخر بولی، میں... میں ڈرتی ہوں۔

بابا بولا چھوڑیے زیادہ بن نہیں!

چچا نے کہا میری عزیز ڈرو نہیں۔ اچھا کتا ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ وہ تجھے نہیں کاٹے گا۔

بابا بولا چھوڑو اسے۔ آدمی کی زبان بے لگام ہوتی ہے۔ خود ہی کتے سے زیادہ سب کو کاٹتی پھرتی ہے۔ بے کار اور بلا سبب چور اور اچکے کوّوں کو کتے سے بہتر ہی ہے؟ کچھ معلوم نہیں کہ ان گندے جانوروں میں کیا خوبی دیکھی ہے۔

اولدوز پھر کچھ نہ بولی۔ اپنے سر پر لحاف کھینچ لیا اور سو گئی۔ جب جاگی تو دیکھا کہ چچا جا چکے ہیں۔ کتا صحن میں بھوں بھوں بھونک رہا ہے اور کوّوں کو اُڑا رہا ہے۔

اس دن کے بعد سے گھر میں پابندی ہو گئی۔ کوئی کوّا نیچے نہیں آ سکتا تھا یہاں تک کہ اولدوز بھی خوف اور ڈر سے صحن میں نہیں جاتی تھی۔ ایک بار بھیڑ کے گوشت کی ایک بوٹی بھی کوٹنے کے لیے لیے جا رہی تھی کہ کتے نے لپک

لیا اور کہا گیا۔ اولدوزنے چیخ ماری اور اندر بھاگ گئی۔

- **پریشانی اور انتظار کے دن**
- **بھوک اور ڈر**

اولدوز چارپائی سے اتری۔ سوتیلی ماں کا زخم جلد ٹھیک ہوگیا لیکن اولدوز کے سر کی چوٹ بہت دنوں بعد ٹھیک ہوئی۔ ماں کا سلوک پھر پہلے جیسا ہوگیا تھا۔ پہلے سے زیادہ اولدوز پر برس پڑتی۔

کوّے کا حال بہت خراب ہوگیا تھا۔ ہمیشہ بھوکا رہتا تھا۔ اولدوز نے کوشش کے باوجود اس کا کھانا پینا وقت پر نہیں پہونچا پاتی تھی۔ کوّے کی آنکھیں چاروں طرف لگی رہتی تھیں۔ بہرا جیسی آواز پر بھونکتا رہتا تھا۔ اولدوز اور کوّے کی واحد امید یاشار تھا۔ اگر یاشار ان کی مدد کرتا ان کا کام ٹھیک رہتا لیکن نہیں جانتے تھے کہ کس ذریعہ سے اسے خبر کریں۔ اولدوز کیلئے ڈر سے چھت پر بھی نہیں جاتی تھی یعنی جا ہی نہیں سکتی تھی۔ کالا کالا کوّا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ یہاں وہاں پھرا کرتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کالا کوّا کھانے ہر وقت گن ملید پکڑ سکا تھا رہتا اور سونگھتا رہتا۔

یاشار کی اماں کبھی کبھی ان کے گھر آتی تھی لیکن اس سے کچھ کہنا نہیں ہو پاتا۔ یہ کیا معلوم کہیں وہ بھی سوتیلی ماں کی دوست نہ ہو؟ آج کل کے لوگوں پر جلد بھروسہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور اب تو ماں اسے کسی کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔

دن پر دن بیتتے گئے۔ پانچ دن انتظار اور پریشانی میں گذر گئے۔ ایک روز موقع ملا۔ اولدوز جانتی تھی کہ بس آج ہی کے دن کوّے کو اڑانا ہے ورنہ مرجائے گا لیکن اسے کس طرح اڑائے وہ نہیں جانتی تھی۔

آخرکار ایک موقع ہاتھ آیا اور یاشار کو دیکھ سکی۔ اس دن ماں کسی شادی میں جانا چاہتی تھی۔ اولدوز بولی۔ ماں میں کتے سے ڈرتی ہوں اکیلے گھر میں

نہیں رہ سکتی۔

ماں جھنجھلا گئی اس کا ہاتھ پکڑا اور یاشار کی ماں کے سپرد کر دیا۔ اولدوز کی دلی ہی دل میں خوش تھی۔ یاشار کو گھر میں نہیں پایا اس کی ماں سے پوچھا یاشار کہاں ہے؟

ماں بولی: مدرسہ گیا ہے میری عزیز۔ آخر کل سے اسکول کھل گئے ہیں۔ اولدوز بیٹھ گئی اور یاشار کا انتظار کرنے لگی۔

## ● کوے کو آزاد کرانے کا پروگرام

دوپہر ہو گئی، یاشار دوڑتا دوڑتا آیا اولدوز کو دیکھا منہ لال ہو گیا اور سلام کیا۔ اولدوز نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ یاشار کی ایک دودھ پیتی بہن بھی تھی۔ اس کی ماں اسے دودھ پلا رہی تھی کہ سو جائے۔ اولدوز اور یاشار صحن میں آ گئے۔

اولدوز نے رنجیدہ اور سست ہو کر کہا: یاشار جانتے ہو کیا ہوا؟

یاشار نے کہا: نہیں۔

اولدوز نے کہا: کوا مر رہا ہے۔

یاشار نے پوچھا کون کوا؟

اولدوز بولی: میرا کوا اور کون؟

یاشار بولا: کیا تمہارے پاس کوا بھی تھا؟

اولدوز نے جواب دیا: ہاں میرے پاس تھا۔ کیا کیا جائے؟

یاشار نے جوش سے پوچھا، تم کو کہاں سے ملا؟

اولدوز بولی: بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی تو بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟

یاشار نے کہا: بھوک سے مر رہا ہے؟

اولدوز نے کہا: نہیں۔

یاشار نے پوچھا، کیا زخمی ہو گیا ہے؟

اولدوز نے کہا: نہیں تو۔

یاشار نے کہا: پھر آخر کیوں مر رہا ہے؟

اولدوز بولی: ابھی تو اڑ نہیں سکتا ہے۔ اگر کوا اڑ نہیں سکتا ہے تو یقیناً مر جاتا ہے۔

یاشار بولا: مجھے دے دو میں اسے اڑنا سکھا دوں گا۔

اولدوز بولی: میں نے اسے زینے کے نیچے چھپا رکھا ہے۔

یاشار نے کہا: تمہاری ماں کو معلوم ہے؟

اولدوز بولی: اگر سونگھ بھی لے تو مار ڈالے۔

یاشار نے کہا: ہمیں کوئی ترکیب کرنی چاہیے۔

اولدوز بولی: پہلے تو ہمیں کتے کو ٹھکانے لگانا چاہیے، کیا اس کی آواز نہیں سن رہے ہو!

یاشار نے کہا: کیوں نہیں سن رہا ہوں، کتا ہمیں کوّے کو نکالنے نہیں دے گا۔ ایک دو دن کا موقع دو۔ میں سوچتا ہوں۔ کوئی ترکیب نکالوں کہ اس کا خاتمہ کر دوں۔

اولدوز نے کہا: وقت نہیں ہے آج ہی کوّے کو باہر نکال لینا چاہیے ورنہ مر جائے گا۔ کوّے کی امّاں نے مجھ سے خود کہا تھا۔

یاشار حیران ہو گیا تھا۔ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی اہم اور پریشان کن کام سامنے آ پڑا ہے۔ جلدی سے پوچھا کوّے کی ماں کون ہے؟

اولدوز نے جواب دیا: کوّے کی امّاں ہے۔ یہ سب بعد میں بتاؤں گی اب ہمیں ایسا کام کرنا چاہیے کہ کوّا مرے نہیں۔

یاشار نے کہا: میں دوپہر کے بعد اسکول نہیں جاؤں گا۔ چوری چوری جا کر کوّے کو لائیں گے۔

سبزی، پنیر اور روٹی کھائی اور کھانے کے بعد یاشار کا بابا کام پر گیا اور ماں دودھ پیتے بچے کو لے کر سو گئی۔

یاشار بولا: میں اور اولدوز نہیں سوئیں گے۔ میں اپنا سبق اور سوال پورا کروں گا۔ یاشار کبھی کبھی اس قسم کا جھوٹ بولا کرتا تھا کہ اس کی والدہ

اسے تنہا چھوڑ دے۔

- قتل
- کوّے کو قید سے آزاد کرانے کے لیے

تھوڑی دیر بعد دونوں باہر نکلے زینوں کو طے کر کے چھت پر گئے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ دیکھا کہ کالا کتا کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور آ کر کوّے کے کھونسلے کے پاس سر جھکائے سو رہا ہے۔

یاشار نے کہا: میں نیچے جاتا ہوں اور کوّے کو لاتا ہوں؟

اولدوز بولی: لیکن دیکھتے نہیں ہو، ٹھیک دروازے پر کتا سو رہا ہے!

یاشار بولا: ٹھیک کہتی ہو، بیچارہ کوّا، دیکھتی ہو کس حال میں ہے؟

اولدوز نے کہا: میں نہیں جانتی کہ وہ زیادہ ڈرا ہوگا، بہادر کوّا ہے۔

یاشار نے پوچھا: اب ہم کیا کام کریں؟

اولدوز بولی: ہمیں کوئی ترکیب کرنی چاہیے۔

یاشار بولا: میں ابھی کوئی ترکیب سوچتا ہوں، ابھی ابھی کوئی پلان بناتا ہوں...

سوتیلی ماں کے سر کا گھڑا چھت پر ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ ماں نے گھڑے کے چاروں طرف پتھر جما رکھا تھا کہ گرے نہیں۔ یاشار کی آنکھ پتھروں پر پڑی، یکایک بولا کہ آؤ کتے کو مار ڈالیں۔

اولدوز لرز گئی، بولی: مار ڈالیں؟

یاشار نے کہا: ہاں، اگر ہم اسے مار ڈالیں تو ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا پا جائیں۔

اولدوز بولی: میں ڈرتی ہوں۔

یاشار بولا: میں اسے مار ڈالتا ہوں۔

اولدوز بولی: گناہ نہیں ہوگا؟

یاشار بولا: گناہ میں نہیں جانتا کہ کیا ہوتا ہے، لیکن پھر کوئی اور دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔ ہم اگر کسی کے ساتھ برائی نہ کریں تو وہ گناہ ہوگا۔

اولدوزبولی: کتا میرے چچا کا ہے۔

یاشار نے جواب دیا: ہوگا۔ کیوں تمہارا چچا اپنا کتا لایا اور یہاں باندھا کر مجھے ڈرا دیئے اور کوتے کو قید کر دیے۔ آہ!

اولدوز کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔ یاشار آہستہ آہستہ گیا ایک بڑا پتھر اٹھایا اور لایا اور اولدوز سے بولا۔ گھر میں کوئی ہے؟

اولدوز بولی: اماں شادی میں گئی ہے۔ ابا کو نہیں جانتی مجھے کتے پر رحم آرہا ہے۔

یاشار بولا: تم سوچتی ہو کہ کتے کو مار ڈالنا مجھے اچھا معلوم ہو رہا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی اور علاج نہیں ہے۔

پھر ایک زینہ نیچے اترا۔ کتے کے سر کے بالکل اوپر۔ اس وقت پتھر کو اوپر اٹھایا اور اچانک نیچے لاکر چھوڑ دیا۔ پتھر گرا اور ٹھیک کتے کے سر پر۔ کتا چیخا۔ آواز پھنس گئی اور ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اچانک اولدوز کے بابا کی آواز کانوں میں پڑی۔ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ بابا باہر آیا اور دیکھا کہ کتا مر رہا ہے۔

یاشار نے اولدوز کے کان میں چپکے سے کہا۔ آؤ ہم اندر چلیں۔ اب تیرا بابا پتھروں کو دیکھے گا اور چھت پر آئے گا۔

اولدوز بولی: کوتے کو چھوڑ دیں؟

یاشار نے کہا: میں پھر آکر اس کا حال چال معلوم کروں گا۔

دونوں چپکے سے نیچے آگئے اور کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ یاشار کتابوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا اور اس طرح کہ جو کوئی دیکھتا خیال کرتا کہ سبق یاد کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا دل دھڑک رہا تھا اور ان کا چہرہ بھی تھوڑا زرد ہو گیا تھا۔ بابا کے پیروں کی چاپ کوٹھے کے اوپر سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ یاشار اکیلا چھت پر گیا۔ اولدوز کے بابا کتے کی لاش کے پاس کھڑے تھے پھر اسے چھوڑ کر گلی میں چلے گئے۔

یاشار کو یاد آیا کہ ایک روز اس نے پتھر پھینکا تھا اور اولدوز کے گھر کا شیشہ توڑ دیا تھا اور آج ہی کی طرح گلی میں نکل گیا تھا۔ اپنے

کو بلایا تھا اور گری سکھوائی تھی۔ انھیں خیالوں کے ساتھ تیزی سے نیچے آیا۔ پہلے کوٹے کو باہر نکالا اور کہا: میں یاشار ہوں۔ کتوے کو مار ڈالا تاکہ تجھے آزادی مل جائے۔

کوٹا سکڑ گیا تھا۔ بولا: شکریہ! لیکن اب وقت گذر گیا

یاشار۔ کیوں؟

کوٹا بولا: میری ماں نے آج دوپہر تک کا وعدہ کیا تھا، وہ وقت ختم ہو گیا۔ میں نے اتنا زیادہ فاقہ کیا ہے کہ اب اڑنے کی سکت نہیں ہے۔

یاشار رنجیدہ ہو گیا۔ بس رونے ہی والا تھا۔ بولا: کیا تم اب میرے ساتھ نہیں آ سکتے کہ تم کو اڑنا سکھا دوں۔

کوٹا بولا: میں نے بتا دیا کہ وقت بیت گیا۔ الدلوز سے کہو کہ میرے چند پر نوچ کر محفوظ رکھ لے آخر کار یہی کبھی تو کوے میرے اور تمھارے سراغ میں آئیں گے۔

کوٹے نے یہ کہا، اپنی چونچ بند کر لی اور اس کا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔

یاشار رونے لگا۔ اچانک ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔ مسکرایا اور کوٹے کی میت کو زینے پر سلا دیا پھر کو اٹھا لے گیا اور باورچی خانہ کے بیچ میں رکھ دیا۔ کتے کی لاش کو شہتوت کے درخت کے نیچے ڈال دیا۔ پانی کے ایک طشت کو الٹا کر کے کمرے کے بیچ میں رکھ دیا پھر کوٹے کو اٹھا کر باہر چلا آیا جب کوٹھے پر آیا تو اسے یاد آیا کہ اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور اسے بھی سلا دیا۔

الدلوز بہت رنجیدہ ہوئی۔ روئی بھی لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور کوئی علاج نہ تھا۔ یاشار نے اسے تسلی دی اور کہا: اگر کام بگاڑنا نہیں چاہتی تو اپنی آواز نہ نکال، کوئی بھانپ نہ لے۔ ان پر ایسی مصیبت آئے کہ وہ بھی جھیلیں۔ آج میں نے استاد سے ایسی چیز سیکھی ہے اور چاہتا ہوں کہ اماں اور بابا کو اتنا ڈراؤں کہ وہ اپنے سایہ تک سے بھاگیں۔

پھر جو کچھ کوٹے نے کہا تھا اور جو کچھ خود کیا تھا الدلوز کو بتایا۔ الدلوز

کے حواس کچھ اپنی جگہ آئے۔ کوٹھے کے چند پر نوچے اور اپنی جیب میں ڈال لیے۔ یاشار کوٹھے کا جنازہ لے گیا ایک جگہ چھپا دیا کہ پھر کبھی دفن کریں گے۔
یاشار کی ماں اپنے بچے کو بازوؤں میں لیے سو رہی تھی۔

- عقل مند بچے
- نادان ماں اور باپ پر غالب

بچے منتظر بیٹھے تھے۔ اچانک رونا پیٹنا شروع ہو گیا اور اولدوز کا بابا ہاؤ ہو کر رہا تھا۔ دوسری آوازیں بھی تھیں۔ یاشار کی اماں نیند سے جاگی اور دوڑ کر صحن میں آئی پھر لوٹی، سر پر چادر ڈالی اور کوٹھے پر گئی۔ اولدوز کا باپ دیوانوں کی طرح ہو گیا تھا۔ رو پیٹ رہا تھا اپنے سر پر کے مار رہا تھا ہائے ہائے میں کہیں کا نہ رہا... میرے گھر میں چڑیلیں آ گئی ہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتا گھر میں جن آ گئے ہیں، میری مدد کرو لوگو!...
سیانے اور چند لوگ اسے گھیرے ہوئے تھے اور اسے چپ کرانا چاہتے تھے۔ اولدوز کا باپ کوٹھے کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور چلا رہا تھا دیکھو اسے یہاں لا کر کون ڈال گیا؟ پتھر کو اٹھا کر کون لے گیا؟ خون کس نے دھویا جنوں نے۔ وہ ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں، پہلے آئے، کتا مار ڈالا... پھر ... ہائے، ہائے۔
اولدوز اور یاشار زینوں پر کھڑے ہوئے تھے، سن رہے تھے یاشار کی اماں ان کو چھت پر جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔ ایک دوسرے کو آنکھ مارتے تھے اور دل ہی دل میں بابا اور دوسرے لوگوں کی بے وقوفی پر ہنس رہے تھے، خوش تھے کہ ان تمام بے وقوفوں کو خوب بے وقوف بنایا۔
بابا کو کھینچ کھانچ کر کمرے میں لے گئے لیکن اچانک ان سب کی خوف سے تھرائی ہوئی آواز بلند ہوئی ہائے خدا کی پناہ، وہی جن....
بابا دوبارہ صحن میں دوڑ گیا اور دیوانوں کی طرح پھر فریاد کرنے لگا

اور ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ دہشت نے سب کو ڈر میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک بوڑھا بولا جنوں نے ہمارے گھر میں بسیرا کر لیا ہے۔ گھر بدلو۔ ایک آدمی جا کر جھاڑ پھونک والے کو دیکھو، دوسرا جائے اور ملا کو لے آئے۔ بابا چلایا میری مدد کرو میرا گھر تباہ ہو گیا۔

ایک آدمی سید جگنی سیانے کے گھر گیا اور دوسرا آدمی تعویذ گنڈا لکھنے والے پیر مرشد ولی کو بلانے گیا۔ ایک بوڑھی عورت دوڑ کر اپنے گھر گئی اور بسم اللہ کا طغریٰ لے آئی تاکہ جنوں کو بھگایا جائے۔ جس در حقیقت کاغذ میں بسم اللہ لکھا ہوا تھا اور ایک پرانے فریم میں لگا ہوا تھا۔ دو آدمیوں نے فریم کو ہاتھ میں لے کر بسم اللہ پڑھتے اندر گئے گھر میں کسی بلا سے سوراخ کرنے کی تلاش میں لگے یکایک ان کی نگاہ باورچی خانہ میں خون لگے بڑے پتھر پر پڑی۔ ڈرتے ڈرتے پتھر کو اٹھایا اور صحن میں لائے۔ جیسے ہی بابا نے پتھر دیکھا پھر زور سے چلایا ہائے ہائے... یہ پتھر یہاں کیا کر رہا تھا؟ کون اسے اٹھا کر یہاں لے گیا؟ جن پری... مجھ کو لگ گئے ہیں... مجھے ستانا چاہتے ہیں ہائے... آخر میں نے کون سا قصور کیا ہے!

اولمدوز اور یاشار دیوار کے پاس کھڑے تھے۔ جب یہ بات سنی تو ان کو ہنسی آ گئی۔ فوراً کمرے میں بھاگے کہ چھت والے لوگ کہیں ان کو دیکھ نہ لیں۔

یاشار نے کہا: اچھا اب اپنی ماں کو آنے دو، دیکھو کیا آفت مچاتی ہے؟ شادی تو اس کے لیے زہر بن جائے گی۔

اس وقت دونوں دل ہی دل میں ہنسے۔ یاشار نے اپنا ہاتھ اولمدوز کے منہ پر رکھ لیا تاکہ اس کی ہنسی کی آواز کوئی سن نہ لے۔

معلوم نہیں تھا کہ کس نے سوتیلی ماں کو یہ خبر پہنچا دی تھی کہ جلدی سے گھر آئی جب اپنے شوہر کو دیکھا بےہوش ہو کر صحن میں گر پڑی۔ عورتیں اسے اٹھا کر بغل والے پڑوسی کے گھر میں لے گئیں۔ بوڑھی عورت کہہ رہی تھی پہلے تو سیانے اور ملا جی آئیں، جنوں کو نکالیں پھر کہیں بچے دار عورت اندر جائے۔

مختصر تھیں وہ دوسرے روز آدھے گھنٹے کے بعد ملا اور جھاڑ پھونک والے آگئے۔ جھاڑنے والے نے ایک لوٹا اٹھا کر کے اپنے سامنے رکھا عجیب و غریب الفاظ اگڑم بگڑم سہا پڑھا، آئینہ مانگا۔ عجیب عجیب آوازیں اپنے منہ اور لوٹے سے نکالیں اور پھر کہا: اے جنو میں تمھیں قسم دلاتا ہوں جنوں کے بادشاہ کی۔ اس مسلمان کے گھر کو چھوڑ دو اور اسے نہ ستاؤ۔

پھر آئینہ کے پاس کان لگا کر اسے ٹھونکا اور اولڈوز کے بابا سے کہا۔ آج ان کی پوجا نہیں ہوئی ہے۔ پچاس روپے مجھے دو تاکہ انھیں چلتا کروں۔

اولڈوز کے بابا نے بہانہ بنایا اور تیس روپے دیے۔ سیانے نے روپے لیے۔ اپنا ہاتھ لوٹے کے اندر لے گیا اور نکالا پھر دوبارہ کہا: اے جنو، اس مسلمان کا گھر چھوڑ دو اسے اذیت نہ دو میں تمھیں جنوں کے بادشاہ کی قسم دلاتا ہوں!

تھوڑی دیر بعد کھڑا ہو گیا اور ہنستا ہوا بابا سے بولا خوش قسمتی سے انھوں نے تمھارا پیچھا چھوڑ دیا اور جلد چلے گئے۔ اب نہیں لوٹیں گے مگر اس شرط پر کہ مجھے خوش کر دو۔

بابا نے آرام کا سانس لیا اور تیس روپے سیانے کو دیے اور اپنا راستہ لیا۔ اب دعا لکھنے والے کی باری آئی۔ ٹیڑھی ترچھی تحریریں پیلی کالی روشنائی سے لکھیں اور کاغذ کے ٹکڑے کر کے ایک کونے میں چھپایا، بیس روپے لیے اور چل دیا۔

سوتیلی ماں کو لائے

کوئی نہیں جانتا تھا کہ سیانے کب آ کر چلے گئے۔

جب رات ہوئی۔ یاشار کی اماں اولڈوز کو اپنے گھر لے گئی۔ بابا اور اماں اس قدر بوکھلائے اور ڈرے ہوئے تھے کہ اس وقت تک اولڈوز اور اس کے بارے میں بھی نہ سوچا تھا۔

## ● برف، جاڑا، بیکاری اور انتظار

بھی بارش کا موسم گیا اور اپنے ساتھ سردی بھی لایا پھر سخت سردیاں
کہ برف اور ٹھنڈک کی حد ہو گئی اولدوز کا چچا اپنے کتے کو معلوم کرنے آیا۔
خالی ہاتھ اور خفا ہو کر لوٹ گیا اور اپنے کتے کے لیے بابا سے لڑائی بھی لڑی۔
ماں کا ڈر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ باورچی خانہ کی دیوار اور دروازے
چھپی اور ہاتھ کی لکھی ہوئی دعاؤں سے بھرے تھے۔ رات میں اکیلے
صحن میں نکلتے بھی ڈرتی تھی، اولدوز کو ساتھ لے جاتی تھی اور اولدوز
بالکل نہیں ڈرتی تھی۔ اکیلی باہر آ جاتی اور دل ہی دل میں بابا پر ہنستی تھی۔
کوے کے پروں کو ریڈیو کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ یاشار سے کم مل پاتی تھی
یاشار نے کوے کی لاش کو ایک اچھی جگہ گاڑ دیا تھا۔ مدرسہ برابر جاتا تھا
اور سبق پڑھتا تھا۔
لیکن کبھی کبھی پنسل گم کرنے پر ماں سے جھگڑا کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنی
پنسل کھو دیتا اور اس کی ماں خفا ہوتی تھی اور کہتی، تجھے بالکل خیال
نہیں ہے کہ تیرا باپ ہزار دکھ جھیل کر پنسل کا پیسہ حاصل کرتا ہے۔
سوتیلی ماں کا پیٹ زیادہ نکل آیا تھا۔ پڑوس کی عورتیں اس
سے کہتی تھیں وہ ایک ہفتہ میں بچہ ہوگا۔
ماں کہتی، شاید جلد ہی۔
پڑوسنیں کہتیں: انشاء اللہ اس بار حیات پائے گا۔
ماں کہتی: انشاء اللہ نذر و نیاز کروں گی یقیناً ہو گا۔
یاشار کا باپ زیادہ تر بے کار رہتا۔ کام پر نہیں جاتا تھا۔ اتنی برف گرتی
تھی کہ اگر کوئی صبح کو باہر نکل کر دیکھتا تو کھڑکیوں کے شیشے تک برف
جم پاتا۔ ٹھنڈک کی تیزی نے گوریوں کو پالا مار دیا تھا اور رخنہ ان کے تودے،

کی طرح زمین پر گر رہی تھیں۔

ایک دن صبح بابا نے دیکھا کہ کوٹھے پر دو کوّے بیٹھے ہیں۔ غلیل اٹھائی اور غلّہ مارا اور دونوں گر پڑے۔ لیکن جب ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ سردی سے ٹھٹھر کر مر گئے ہیں۔ اولدوز بہت رنجیدہ ہوئی۔ یاشار نے یہ خبر چند دن بعد اپنی ماں سے سنی اپنے آپ سے بولا: کہیں کوّے کی تلاش میں نہ آئے ہوں بیچارے پرندے۔

یاشار کی اماں صبح روزانہ آتی اور ماں کی مدد کرتی۔ برتن دھوتی، گھر جھاڑتی، دوپہر بعد بھی جاتی تھی اپنے گھر تو دن کی کام کرنے والی تھی اولدوز اسے چاہتی تھی بری عورت نہ تھی۔ کبھی ماں چلی جاتی تو اولدوز اس سے کچھ بات کر لیا کرتی تھی۔ یاشار کا حال چال معلوم کرتی اور سلام بھی کہلاتی۔ دوسری پڑوسنیں بھی آتی جاتی رہتیں لیکن اولدوز یاشار کی اماں کو زیادہ چاہتی تھی۔ اس کے باوجود اس پر کبھی کچھ نہ ظاہر ہونے دیتی۔ اکیلی کوّوں کا انتظار کر رہی تھی یقین تھا کہ کسی دن وہ آئیں گے۔

بابا ہمیشہ کی طرح اپنے دفتر چلا جاتا اور سا‌ڑھے پانچ بجے گھر لوٹ آتا۔ ایک رات اپنی بیوی سے بولا: میرا جی چاہتا ہے تمہارے لڑکا ہو۔ اگر اس بار بچہ زندہ رہ گیا اور چلنے پھرنے لگا تو اولدوز کو دوسری جگہ بھیج دوں گا تاکہ تو آرام پا جائے۔ لیکن اگر اس بار بھی مردہ بچہ پیدا ہوا تو پھر میں اولدوز کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتا۔

ماں امید میں تھی کہ اس کا بچہ زندہ رہے گا کیونکہ بہت زیادہ نذر اور نیاز کی تھی۔ اولدوز اس پیدا نہ ہونے بچے سے نفرت کرتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ دنیا میں مردہ ہی پیدا ہو۔

- نذر اور نیاز موت کو نہیں ٹال سکتے
- کوّے کی اماں کا ذکر

آخر ماں کے بچہ پیدا ہوا۔ بچہ زندہ تھا جادو ٹونا کیا گیا نذر نیاز ہوئی دعا پڑھی

گئی، طلسم اور دعائیں اور قربانی کی نظر اتاری اتاری گئی۔ علی اصغر کے روضہ پر چراغ جلائے اور کیا کیا نہ کیا گیا کس لیے؟ اس لیے کہ وہ زندہ رہے لیکن پہلے ہی ہفتہ میں اسے بیماری ہو گئی۔ ڈاکٹر آیا اور بولا: ماں کے پیٹ میں ہی یہ ٹھیک نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے بچ سکے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

دوسرے روز بچہ مر گیا۔

ماں کمزوری اور غصہ کی وجہ سے بہت بیمار پڑ گئی۔ دن رات کہتی رہتی میرے بچے کو جنوں نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اب بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا ہے اور جلنے والے کی آنکھ اندھی ہو جائے۔ مجھ سے ایک جلتی بھی تھی اور میرے بچے کو مار ڈالا۔

یاشار کی ماں سارے دن اس کی ماں کے پاس رہتی۔ یاشار کبھی دوپہر کا کھانا کھانے اپنی اماں کے پاس آتا اور اللہ وزنہ سے دو چار باتیں بھی کر لیتا تھا۔ کوّوں کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ صرف کبھی کبھار کوئی اکیلا کوّا آسمان پر اڑتا ہوا گزر جاتا یا اس کی کائیں کائیں کی آواز کانوں میں آتی اور جلد ہی ڈوب جاتی۔ تبریزی پیڑ بالکل ننگے اور خالی کھڑے تھے۔ اللہ وزنہ کو کوّی کی یاد آجاتی کہ کس طرح نازک شاخوں پر بیٹھ جاتی تھی، کائیں کائیں کرتی تھی، ہلتی ڈولتی تھی، یکایک پروں کو سمیٹتی تھی اور اڑ جاتی تھی۔

## ● مشکل جاڑا

جاڑوں کے دن بہت سخت تھے بہت ہی سخت جلد ہی گلی میں برف کا ڈھیر دیواروں سے مل کر لگ گیا۔ تیل اور کوئلہ نایاب ہو گیا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں ملتا تھا۔ یاشار کا باپ بستر پر بیمار رہتا تھا۔ اس کی ماں دوسرے گھروں میں جا کر برتن اور کپڑے دھوتی تھی۔ کبھی کبھی یقین نہ ہونے والی خبریں لایا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر یہ کہتی: کل جاڑے کی زیادتی سے غریبوں کا ایک پورا خاندان اکڑ کر مر گیا۔ ایک روز روتی ہوئی آئی اور سوتیلی ماں سے بولی: رات

میرا بچہ کرسی کے نیچے سو یا سو یا سکڑ کر مر گیا۔

یاشار بہت رنجیدہ ہو گیا تھا۔ اسے اپنی چھوٹی بہن کی موت کی فکر پاگل بنائے دے رہی تھی۔ اولدوز کے پاس آکر رو دیا اور بولا: میں بھی ٹھنڈک سے اکڑ کر مرتے مرتے بچا آخر ہماری کرسی کے نیچے کا حصہ زیادہ تنگ ہے اور ٹھنڈا ہے۔ کوئلہ نہیں ہے۔

اولدوز نے اس کے آنسو پونچھے اور بولی: نہ رو یاشار ورنہ مجھے بھی رلائی آرہی ہے۔

یاشار چپ ہو گیا اور بولا: صبح میرے بابا اماں سے کہہ رہے تھے کہ ان دنوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو یہ کہے کہ فلاں کے پاس کوئلہ نہ ہوگا۔

اولدوز نے کہا: تمہارے بابا کام کرتے ہیں؟

یاشار بولا: نہیں۔ دن بھر گھر میں پڑا پڑا سوتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی سڑکوں کی برف جھاڑنے جاتا ہے۔

اولدوز نے کہا: کیوں کام ڈھونڈنے نہیں جاتا؟

یاشار بولا: کہتا ہے کہ کام ہے ہی نہیں۔

اولدوز بولی: کیوں کام نہیں ہے؟ یاشار نے کچھ نہ کہا۔

## ● بہار کی خوشبو

برف کم ہونے لگی۔ بہار کا پتہ لگنے لگا اور برف پانی بن کر پگھلنے لگی۔ ہریالی نظر آنے لگی اور پھول کھل گئے جاڑے نے بہت لوگوں کا حال خراب کر دیا تھا اور پھر بھی اس ٹھنڈک کے باوجود بہت سے لوگ زندہ رہ گئے تھے۔

یاشار کی اماں نے اپنی ٹھنڈی اور خالی کرسی ٹھیک ٹھاک کر لی کھڑکی کھول دی۔ یاشار کے بابا دس بیس آدمیوں کے ساتھ دوبارہ تہران چلے گئے تاکہ وہاں اینٹ کے بھٹوں میں کام کرے۔ گھر میں یاشار اور اس کی اماں اکیلے رہ گئے۔ جیسے گذشتہ سالوں میں رہا کرتے تھے۔

سوتیلی ماں کا حال کچھ ٹھیک ہو گیا تھا لیکن اولدوز کو دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اولدوز زیادہ تر یاشار کے گھر میں رہتی تھی اور وہاں بھی لب زیادہ نہیں بولتی تھی بابا اولدوز کو چاہنے لگے تھے لیکن اولدوز کو وہ بھی برا لگتا تھا۔ بابا کہتے تھے کہ اگلے سال تجھ کو مدرسہ بھیجوں گا۔

## ● کوّوں کی زبان کون سمجھتا ہے؟

اپریل کا مہینہ آ پہونچا یاشار سالانہ امتحان کو نپٹانے میں لگا ہوا تھا ایک دن اولدوز سے بولا: کل میں نے دو کوّے دیکھے جو مدرسہ کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔

اولدوز اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور بولی: اچھا، پھر اس کے بعد؟

یاشار بولا: پھر میں کلاس میں چلا گیا۔ حساب کا پرچہ تھا جب میں باہر آیا تو دیکھا کہ نہیں تھے۔

اولدوز آہستہ سے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ یاشار نے پوچھا رنج کرتی ہو کیا؟ اگر وہ ہمارے کوّے ہوں گے تو لوٹ کر آئیں گے۔

اولدوز نے کہا: کیا تم نے بات کی تھی۔

یاشار نے کہا: موقع نہ تھا اور پھر یہ کہ میں کوّوں کی زبان سے آشنا نہیں۔

اولدوز بولی: یقیناً تم جانتے ہو۔

یاشار بولا: تم کیسے جانتی ہو؟

اولدوز بولی: اس لیے کہ تم بہت مہربان ہو اور اس لیے بھی کہ تمہارا دل صاف ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ تمام چیزیں صرف اپنے لیے نہیں چاہتے ہو اور یوں بھی کہ تم میری سوتیلی ماں کی طرح نہیں ہو؟

یاشار نے جواب دیا: یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟

اولدوز بولی: تمام اچھے بچے کوّوں کی زبان سے واقف ہیں کوّے کی ماں کہتی تھی۔ میں یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہی ہوں۔

یاشار یہ بات سن کر خوش ہو گیا اور خوش ہو کر اولدوز کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ لے لیا اور دباتے ہوئے بولا: میں کچھ نہیں جانتا کہ اس دن کوّے سے میں نے کس طرح بات کی۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔

## ● کوّوں کی واپسی

دو تین دن بیت گئے اور گرمیاں آ گئی تھیں اور موسم گرم ہو رہا تھا۔ بڑے لوگ دن کا کھانا کھا کر سونے کی خواہش کرتے تھے جیسے ہی دن کا کھانا کھاتے سونے لگتے تھے بچوں کو بھی زبردستی سلاتے تھے۔

ایک دن یاشار امتحان کا آخری پرچہ ختم کر چکا تھا اور گھر کو لوٹ رہا تھا۔ اسکول کے تھوڑے فاصلہ پر مسجد تھی اور سامنے شہتوت کا درخت لگا ہوا تھا۔ شہتوت کے درخت کے پیچھے یاشار نام کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا، کسی کو نہ پایا اور گلی بالکل خالی تھی۔ چاہا کہ آگے بڑھے کہ دوبارہ پیچھے سے پکارا گیا یاشار!

یاشار پیچھے کی طرف پلٹا۔ اچانک اس کی نگاہ دو عدد کوّوں پر پڑی جو شہتوت کے پیڑ پر بیٹھے ہوئے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ یاشار کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ بولا۔ کوّوں، تم مجھے کہاں سے پہچانتے ہو؟

ایک کوّا نرم آواز میں بولا: جناب یاشار، تم اولدوز کے دوست نہیں ہو؟

یاشار بولا: کیوں، میں اس کا دوست ہوں۔

دوسرا کوّا اپنی موٹی سی آواز میں بولا: یہ سچ ہے کہ ہماری ماں نے تم کو نہیں دیکھا تھا لیکن تمہارا پتہ اولدوز نے اسے بتایا تھا ہم بہت دیر سے مدرسہ کے آس پاس منڈلا رہے تھے تا کہ تجھے پائیں، ہم پہلے اولدوز سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ ہماری دادی نے پوچھوایا تھا کہ اولدوز کی طبیعت کیسی ہے!

یاشار نے کہا: اسے ڈر ہے کہ تم لوگ اسے بھول گئے ہو گے۔ جناب کوّے صاحب بولی آواز والا کوّا بولا: معاف کرنا ہم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ میں اس کوّے کا بھائی ہوں جو تم نے پالا تھا اور بعد میں مر گیا۔ یہ بھی میری بہن ہے۔ اسے کوکی خانم پکارو۔

خانم کوکی بولی: ہمارا ایک بھائی اور بھی تھا جو کہ سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا۔ ہمارا باپ بھی ماں کے رنج میں مر گیا۔

یاشار نے کہا: آپ لوگ سلامت رہیے۔

کوّے بولے: ہم شکریہ ادا کرتے ہیں

یاشار تھوڑا سوچتا رہا پھر بولا: اچھا نہیں ہے کہ ہم یہاں آئیں اور بات کریں۔ چلو میرے گھر چلو۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔

کوّوں نے مان لیا۔ یاشار چل پڑا کوّے بھی اس کے سر پر اڑ چلے۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ یاشار کا کیا حال ہے۔ اپنے آپ کو اتنا بڑا محسوس کر رہا تھا کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ کبھی آسمان میں دیکھتا، کوّوں کو دیکھتا تھا، مسکراتا تھا اور پھر چل پڑتا تھا۔ آخر کار گھر پہنچ گئے۔ پڑوسیوں سے گھر کی کنجی لی اور اندر گیا۔ اس کی اماں شہر کے وقت گھر نہیں آتی تھی۔ کوّے نیچے آ گئے اور زینے پر بیٹھ گئے۔ یاشار نے پوچھا اولدوز سے ملنا نہیں چاہتے

اسی وقت دیوار کی دوسری طرف سے اولدوز کے رونے کی صدا بلند ہوئی۔ تینوں چپ ہو گئے۔ پھر خانم کوکی نے کہا: اب اولدوز سے نہیں ملا جا سکتا۔ ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

کوّے جناب بولے: ہاں ہم شہر لوٹ چلیں اور کوّوں کو خبر کر دیں پھر ہم آکر دیکھیں گے۔ ہم آج ہی آئیں گے۔ ہمارا سلام اولدوز کو پہنچا دینا

جس وقت یاشار اکیلا رہ گیا، کوٹھے پر گیا۔ کتابوں کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن اولدوز صحن میں نہیں آئی تو لوٹ آیا۔ اس کی اماں نے پنیر اور روٹی رکھ دی تھی، دن کا کھانا کھایا پھر دوبارہ چھت پر گیا۔ موسم گرم تھا۔ اس نے اپنا کرتا اتار دیا اور چھت پر لیٹ گیا۔ چاہتا تھا آسمان میں نگاہیں گاڑ دے آسمان

چمکیلا اور نیلا تھا۔ چند پرندے اس صاف آسمان میں اڑ رہے تھے اور اپنے پر شاید اس لیے نہیں ہلا رہے تھے کہ کہیں ان کے سر ٹکرا نہ جائیں۔

## ● کہیں جانے کا وعدہ مگر پھر لوٹنا بھی

دن کے کھانے کا دسترخوان بچھا ہوا تھا بابا نے اولدوز کو اپنی بغل میں بیٹھا رکھا تھا اولدوز کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں، پھک پھک کر رو رہی تھی۔ سوتیلی ماں کہہ رہی تھی: اس کا جی ڈنڈے کھانے کو چاہ رہا ہے اور شور مچا رہی تھی۔

بابا بولا: پیاری بیٹی، تم تو ہر بات ماننے والی بیٹی تھیں تمہارا مقصد کیا ہے؟

اولدوز کچھ نہیں بولی، سسکتی رہی۔ ماں بولی کہتی ہے میں اکیلے پن سے گھبراتی ہوں مجھے یاشار کے گھر جا کر کھیلنے کی اجازت دو۔

اچانک اولدوز بولی: بابا میرا دل سہیلی یا دوست کے ساتھ کھیلنے کو چاہتا ہے۔ تنہائی سے پریشان ہو گئی ہوں۔

پھر تھوڑی دیر کی بک بک جھک جھک کے بعد بابا نے وعدہ کیا کہ کبھی کبھی یاشار کے پاس جائے گی اور جلدی لوٹ آئے گی۔ اولدوز بہت خوش ہو گئی۔ دن کے کھانے کے بعد بابا اور ماں سو گئے اولدوز چل پڑی اور چھت پر گئی اس کا جی چاہتا تھا وہاں بیٹھے اور کوؤں کا انتظار کرے۔ اچانک اس کی نگاہیں یاشار پر پڑیں جو گہری نیند سو رہا تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ اولدوز جا کر یاشار کے سرہانے بیٹھ گئی اس کے بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرا اور یاشار نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور ہنسا۔ اولدوز بھی ہنسی۔ یاشار اٹھ کر بیٹھ گیا اپنا کرتا پہنا اور بولا: اولدوز جانتی ہو کہ میں کیا خواب دیکھ رہا تھا۔

اولدوز بولی: نہیں!

یاشار بولا: میں خواب دیکھ رہا تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا ہے، بادلوں پر سوار ہیں اور ہم لوگ خانم کوتی کی شادی

میں شریک ہونے جا رہے ہیں اور دوسرے کوّے بھی ہمارے پیچھے چلے آ رہے ہیں
اولدوزر کا منہ لال ہو گیا۔ پھر بولی: یہ خانم کوّسی کون ہیں!
یاشار بولا: میں نے تمھیں نہیں بتایا!
اولدوز بولی: نہ۔
یاشار نے کہا: کوّوں سے میں نے ملاقات کی بات کی۔
اولدوز نے پوچھا: کب!
یاشار بولا: جب میں اسکول سے لوٹ رہا تھا کوّے کے بھائی اور بہن تھے وعدہ کیا ہے کہ آج آئیں گے۔
اولدوز بولی: پھر خانم کوّسی ہمارے مرحوم کوّے کی بہن ہے!
یاشار نے کہا: ہاں۔
اولدوز بولی: کوّوں کے ابا کا کیا حال ہے!
یاشار نے بتایا: بتا رہے تھے کہ اباّ کوّسی کی موت کے غم میں مر گیا۔
اس وقت دو کوّے درختوں کے پیچھے سے ظاہر ہوئے اور آ کر چھت پر اترے پھر زمین پر آئے اور سلام کہا: اولدوز نے ایک ایک کو پکڑا اور چوم کر اپنے دامن میں چھپا لیا۔ حال چال پوچھنے کے بعد کوّا جناب بولا: اولدوز سارے کوّے کہتے ہیں کہ تمھیں ہم لوگوں کے پاس آنا چاہیے۔
اولدوز بولی: مطلب یہ کہ میں اس گھر سے بھاگ جاؤں۔
کوّا جناب بولا: ہاں بھاگ چلو اور ہم لوگوں کے ساتھ آ جاؤ۔ اگر یہاں رہو گی تو پریشان رہو گی اور مر جاؤ گی۔ ہم جانتے ہیں سوتیلی ماں تم کو بہت پریشان کرتی ہے۔
اولدوز بولی: میں کس طرح بھاگ سکتی ہوں، بابا اور اماں نہیں چھوڑ دیں گے۔ چچا بھی، جب سے ان کا گتا مار ڈالا گیا ہمارے گھر نہیں آئے ہیں۔
خانم کوّسی نے کہا: اگر تم چاہتی ہو تو کوّے جانتے ہیں کہ تم کو کس طرح لے جائیں۔

یاشار نے یہاں تک کچھ نہ کہا تھا۔ اس وقت بول اٹھا: میں چلی جائے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔

خانم کوتی نے کہا: یہ تو خود اس کی خواہش پر ہے، تم کیا سوچ رہے ہو یاشار؟

یاشار بولا: مجھے تمہاری بات منظور ہے۔ اگر یہاں رہے گی تو مر جائے گی اور کوئی کام بھی نہیں کر سکتی ہے۔ لیکن اگر کوّوں کی بستی میں چلی گئی... میں نہیں جانتا کیا ہوگا۔

کوّا جناب بولا: کل ہم پھر آرہے ہیں اور پھر بات چیت کریں گے۔ اولدوز تم بھی اپنی بات کل تک طے کر کے بتا دو۔

کوّے چلے گئے۔ اولدوز نے پوچھا: تمہارے خیال میں مجھے جانا چاہیے۔ یاشار نے کہا: ہاں، چلی جاؤ لیکن پھر لوٹ آؤ۔ وعدہ کرتی ہو کر لوٹ آؤ گی؟

اولدوز بولی: وعدہ کرتی ہوں یاشار!

## ● بڑی امّاں

## ● بھاگنے کا راستہ اور طریقہ بتاتی ہیں

دوسرے روز ظہر کے وقت کوّے آئے۔ ایک بزرگ کوّا بھی ان کے ساتھ تھا۔ کوتی خانم بولیں: یہ بھی بڑی اماں ہیں۔

بڑی امّاں یاشار اور اولدوز کے پاس گئیں اور ان کے سامنے بیٹھ گئیں اور بولیں: سارے کوّے خوش ہیں کہ تم کو پالیا گیا۔ میرا بیٹا تمہاری بہت تعریف کیا کرتا تھا۔

اولدوز نے پوچھا: بی کوتی تمہاری بیٹی تھی؟

بڑی اماں نے کہا: ہاں بڑی اچھی کوتی تھی!

اولدوز نے آہ بھرتے ہوئے کہا: وہ میرے لیے ماری گئی۔

بڑی اماں بولی: کوّے ایک دو ہی نہیں ہیں۔ مرنے اور مار ڈالے جانے سے ختم نہیں ہوتے ہیں۔ اگر ایک مرتا ہے تو دو عدد پیدا ہو جاتے ہیں۔

بادشاہ بولا: اولدروز تمھارے پاس آنا چاہتی ہے۔

بڑی اماں بولیں: بہت اچھا! بس ہم کو اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔

اولدروز بولی: جب بھی میرا جی چاہا تو کیا میں لوٹ سکتی ہوں؟

بڑی اماں نے کہا: یقیناً تم لوٹ سکتی ہو۔ ہم کوّوں کو یہ پسند نہیں کہ کوئی اپنا گھر، زندگی اور دوستوں کو چھوڑ کر بھاگ جائے اور آرام سے زندگی گزارے لیکن دوسروں کی خیریت سے بے خبر ہو۔

اولدروز بولی: مجھے کس طرح اپنے پاس لے جاؤ گی؟

بڑی ماں بولی: تمام چیزوں سے پہلے ایک مضبوط جال کی ضرورت ہے اسے تم لوگوں کو خود ہی بُننا چاہیے۔

اولدروز بولی: جال ہمارے کس کام آئے گا؟

بڑی اماں بولی: اس کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ کوّے یہ جانیں گے کہ تم لوگ کاہل اور بیکار نہیں ہو اور اپنی خوشحالی کے لیے محنت کرنے اور پریشانی اٹھانے کے لیے تیار ہو۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تم اس پر بیٹھو گی۔ اور کوّے تم کو اڑا کر اپنے شہر لے جائیں گے۔

بادشاہ بات کے بیچ بول پڑا اور کہا: معاف کرنا بڑی اماں ہم سوئی اور دھاگا کہاں سے لائیں گے کہ جال بنیں گے؟

بڑی اماں بولی: کوّے ہمیشہ تیار ہیں کہ اچھے انسانوں کا کام اور ان کی خدمت کریں۔ ہم اون لے آئیں گے تم دونوں انھیں کاتو اور بٹو کئی بڑے چھت پر بیٹھے۔ سوتیلی ماں انھیں سر کے گوشے سے چاروں طرف جھانک رہی تھی۔ بڑی ماں بولی: ہم اون لائیں گے اور اس کے درمیان رکھ دیں گے۔

تھوڑی دیر یہاں وہاں کی بات کی اور پھر کوّے چلے گئے۔

اولدروز بولی: بادشاہ میں تو بالکل نہیں جانتی کہ کس طرح دھاگا کاتوں

اور جال بنوں

یاشار بولا: میں جانتا ہوں میں نے اپنے باپ سے سیکھا ہے۔

- کوّے تلاش کرتے ہیں
- بچے جان توڑ کوشش کرتے ہیں
- اور کام آگے بڑھتا ہے۔

یاشار کا اسکول بند ہو گیا۔ اب اس کی نادری کی معلومات بڑی اماں کو تھی۔ اپنے بابا کا خط پڑھ سکتا تھا۔ مطلب نکال کر اپنی اماں کو بتا سکتا تھا اور کتاب بھی پڑھ لیتا تھا۔ اس کی اماں پھر دوسروں کے یہاں کپڑے دھونے جاتی تھی۔ بابا اینٹ پکانے کے بھٹوں میں تہران شہر میں کام کرتا تھا۔ زیادہ کوّے ان کے گھروں میں آنے جانے لگے تھے۔ سوتیلی ماں بھی آسمان پر نگاہ کرتی اور کوّوں کی زیادتی سے اس پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ اولدوز اپنی طرف سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ ماں خفا اور رنجیدہ ہوتی اور کبھی اپنے آپ سے کہتی تھی۔ کہیں لڑکی کوّوں سے ساز باز نہ رکھتی ہو؛ لیکن ستائی ہوئی اولدوز اس قسم کی کسی چیز کا اظہار نہیں ہونے دیتی تھی۔

دھاگوں کو بٹنے کا کام یاشار کے گھر میں جاری تھا۔ یاشار پیروں پر کھڑا ہو جاتا اور بڑے آدمیوں کی طرح تکلی سے دھاگا بٹتا تھا۔ اولدوز دھاگوں کو ہاتھ سے بل دیتی تھی اور زیادہ سے زیادہ دھاگے تیار کرتی تھی۔ صحن میں ایک خالی چھوٹا گھونسلہ تھا۔ وہ ریلیوں کو اسی میں چھپا دیتے تھے۔

بڑی اماں بھی کبھی وہاں آ نکلتی اور کام کا طریقہ معلوم کرتی تھی۔ یاشار بٹے ہوئے دھاگے دکھاتا تھا۔ بڑی اماں ہنستی اور کہتی تھی شاباش! اچھے بچوں شاباش، کہیں کوئی دوسرا پتہ نہ لگائے کہ تم لوگ یہ کام چھپا کر کرتے ہو، تم لوگ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔

یاشار اور اولدروز کہتے تھے: تمہارا دل چھوٹا نہ ہو بڑی اماں ٹھیک ہے کہ
ہماری عمر کم ہے لیکن ہماری عقل بڑی ہے۔ ہم اچھا بھی جانتے ہیں کہ انسان کو
ہر کام اور راز بتانا نہیں چاہیے کچھ کام ظاہری طور پر کیے جاتے ہیں اور کچھ
کاموں کو چھپا کر کیا جاتا ہے۔ بڑی اماں اپنی عمر کی پونجی کو زمین پر رگڑ رہی
تھی اور کہتی تھی۔ تم لوگ مجھ کو بہت اچھے لگتے ہو۔ تم اپنے ماں باپ سے بھی
بہت مختلف ہو۔ شاباش، شاباش لیکن ابھی تم لوگ بچے ہو تجربہ کار نہیں
ہوئے ہو۔ تم لوگوں کو بہت زیادہ سیکھنا چاہیے اور اس سے اور زیادہ
سوچنا چاہیے۔

کبھی خانم کوئی اور ان کے بھائی بھی آیا کرتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھتے اور
باتیں کرتے تھے۔ اپنے شہر کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ تبریز کی درختوں کا ذکر کرتے
بادل، ہوا، پہاڑ، جنگل، میدان اور تالابوں کے بارے میں بتاتے۔ اولدروز اور
یاشار کے پاس سات کوؤں سے واقف ہو گئے تھے۔ کوئی خانم کہتی تھی: کوؤں
کی بستی میں ہزار لاکھ سے بھی زیادہ کوّے بستے ہیں۔ یہ باتیں بچوں کو خوش
کرتی تھیں اور دس لاکھ کوّے انتظار رہتے ہیں اور کبھی ان میں آپس میں جھگڑا
نہیں ہوتا ہے۔ کتنا اچھا ہے یہ۔

## اولدروز کا اہم سفر

ایک روز یاشار اور اولدروز دھاگا کات رہے تھے۔ اولدروز نے اپنا
سر اٹھایا اور دیکھا کہ یاشار چپ چاپ کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا ہے بولی: کیوں میری
طرف اس طرح دیکھ رہے ہو یاشار آخر بات کیا ہے؟

یاشار بولا: میں سوچ رہا تھا۔

اولدروز نے پوچھا: کیا سوچ رہے تھے؟

یاشار نے کہا: کچھ نہیں بس یونہی۔

اولدروز بولی: مجھے تمہیں بتانا چاہیے۔

یاشار بولا: اچھا، بتاتا ہوں، میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں سے چلی گئیں

تو میں اکیلے پن سے گھبرا جاؤں گا۔

اولدوز بولی: کل میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ کاش ہم دونوں سفر ساتھ کرتے۔ اکیلا سفر کرنا زیادہ مزیدار نہیں ہوتا ہے۔

یاشار بولا: بس تم چاہتی ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ آؤں!

اولدوز بولی: میں تہہ دل سے چاہتی ہوں، لیکن بڑی اماں کو بتا دینا

یاشار بولا: میں خود ہی کہوں گا۔

دوسرے دن بڑی اماں آئیں۔ یاشار نے کہا بڑی اماں، کیا میں بھی اولدوز کے ساتھ آپ کے یہاں آ سکتا ہوں؟

بڑی اماں نے جواب دیا: تم آنا چاہو تو آ سکتے ہو لیکن تمہیں اپنی ماں پر رحم نہیں آتا ہے! وہ تو بری ماں نہیں؟ چھوڑ دو اور بھاگ جاؤ!

یاشار بولا: میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے۔ روانہ ہونے سے ایک دن پہلے میں اسے بتاؤں گا۔

بڑی اماں بولی: اگر منظور کرے تو کوئی حرج نہیں ہے ہم تمہیں بھی لے جائیں گے۔ اولدوز اور یاشار خوشی سے اچھل پڑے اور تیزی سے کام میں لگ گئے۔

● مچھلی چور اور ان چور

● بے اثر دعائیں۔

یاشار امتحان میں پاس ہو گیا۔ جس دن اپنا رزلٹ کارڈ گھر لایا اچھے بابا کو ایک خط بھی لکھ ڈالا۔ اولدوز اور یاشار زیادہ تر ایک ساتھ رہتے۔ سوتیلی ماں انھیں کم ستاتی تھی۔ سچ ہے وہ چاہتی تھی کہ اولدوز اس کی آنکھوں سے دور رہے۔ اس کے علاوہ ہمیشہ کوؤں کی طرف متوجہ رہتی۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی مصیبت اس کے سر پہ نہ آ کھڑی ہو۔ بابا بھی غصہ تھا۔ خاص طور پر ایک روز جب حوض کے پاس گیا، دیکھا کہ مچھلیاں نہیں ہیں۔ دو مچھلیوں کو کوکو اور اس کے بھائی چٹ کر چکے تھے اور تیسری کو بڑی اماں صاحبہ اور ساتھیوں کو

دوسرے کوّے۔ سوتیلی ماں اور بابا جہاں کہیں کوّا دیکھتے اسے گالیاں دیتے اور پتھر مارتے۔

ایک روز بابا کشمش خرید کر لایا تھا تاکہ ماں ان کا سرکہ بنائے۔ سوتیلی ماں نے مشکا اٹھایا اور کوٹھے پر لے گئی۔ پتھروں کو ادھر اُدھر کیا، ایک اون بڑی مقدار میں نکالا اور بہت سا اون اٹھایا اور اپنے شوہر کے پاس لے آئی اور بولی دیکھیے کہ جنوں نے ہم کو شکست دے دی ہے۔ ابھی انھوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ انھیں پتھروں کے نیچے کس نے جمع کیا ہے؟

بابا بولا: ان کا علاج کرنا چاہیے۔

سوتیلی ماں بولی: کل میں دعا لکھنے والے ملا جی کے پاس جاؤں گی۔ اچھی سی دعا اس سے لوں گی تاکہ جنوں کو ڈرا دے اور وہ بھاگ جائیں۔

دوسرے روز اولدوز نے یاشار سے ملاقات کی اور ماں بابا کی باتیں اسے بتائیں۔ یاشار ہنسا اور بولا کہیں اون چرا لینا چاہیے۔ ورنہ چند دنوں کے بعد ہمارا کام رک جائے گا۔ اولدوز اون چرا لائی اور لا کر کتے کی خالی کوٹھریا میں رکھ دیا۔ یاشار نے دیکھا کہ اون بہت زیادہ جمع ہو گیا ہے۔ کوّوں کو خبر کر دی کہ اب اور زیادہ اون نہ لائیں۔ ماں ملا جی کے پاس گئی اور اچھی سی دعا لے آئی۔ لیکن جب دیکھا کہ اون کو غائب کر لے گئے ہیں تو اس کی بے چینی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔

- یاشار اپنی ماں سے اجازت مانگتا ہے
- سمجھدار کتے کا جھگڑا

اس دن کے بعد کوّوں نے جال بننا شروع کر دیا۔ پہلے موٹی رسیاں ٹھیک کیں اور پھر گرہ لگانے لگے۔ یاشار کی والدہ کے پاس ایک چارپائی کی لمبی رسی تھی اور یہ کئی تاروں سے ملا کر بٹی ہوئی تھی۔ یاشار اس مضبوط رسی کو اپنی ماں سے لینا چاہتا تھا تاکہ پتلی رسیوں کے درمیان رکھ کر جال کو بہت مضبوط بنائے۔

ایک رات کھانا کھاتے وقت اپنی ماں سے بولا: اماں، اگر میں چند دنوں کا سفر کروں تو کیا تم بہت ناراض ہوگی؟

ماں نے سوچا کہ یاشار مذاق کر رہا ہے۔

یاشار نے دوبارہ پوچھا: ماں، تم مجھے چند دن سفر پر جانے کی اجازت دوگی میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد لوٹ آؤں گا۔

اس کی ماں بولی: پہلے یہ بتا کہ اس سفر کا پیسہ کہاں سے آئے گا۔

یاشار بولا: پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

ماں نے پوچھا: اچھا کس کے ساتھ جا رہے ہو؟

یاشار نے کہا: میں ابھی نہیں بتا سکتا، جاتے وقت معلوم ہو جائے گا۔

ماں بولی: اچھا کہاں جا رہا ہے؟

یاشار بولا: یہ بھی جاتے وقت بتاؤں گا۔

اس کی ماں نے کہا: پھر میں بھی جاتے وقت اجازت دوں گی۔

ماں سوچتی تھی کہ یاشار یونہی مذاق کر رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس سے چند سال پہلے کی طرح کی خوب موٹی موٹی باتیں کرے۔ جب یاشار چھوٹا اور پہلی کلاس میں تھا، کبھی کبھار اسی قسم کی ہکلانے اور تتلانے والی باتیں کرتا تھا۔ مثلاً تکیہ پر بیٹھ جاتا اور کہتا: میں آسمان پر جانا چاہتا ہوں تاکہ چند چھوٹے ستارے توڑ لاؤں اور اپنی کوٹ میں بٹن بنا کر ٹانک لوں۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان چھوٹے ستاروں میں سے ہر ایک لاکھوں لاکھ اور اس سے بھی زیادہ بڑا ہے اور ان میں سے چند ایک تو اس کی ماں کی کرسی کے تنور سے بھی زیادہ گرم ہے۔

ایک دن گھومتے ہوئے کالے کتے کو بھی کھینچ کھانچ کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس کے بابا اور ماں نے پوچھا: بیٹے اس گندے جانور کو گھر کیوں لے آئے؟

یاشار نے ڈھیٹ بنتے ہوئے گھمنڈ سے کہا: ایسی بات نہ کہیے، یہ کتا بات سمجھتا ہے۔ میں نے بہت دنوں محنت کی ہے اور اسے زبان سکھائی ہے اب جو کچھ میں اس سے کہوں مان لیتا ہے۔

اس کا بابا ہنستے ہنستے بولا: اگر سچ کہتے ہو تو اس سے کہو کہ دو عدد تندور کی روٹی خرید کر لائے، یہ پیسہ بھی ہے۔

یاشار بولا: پہلے اسے کھانا چاہیے پھر...

ماں نے تھوڑی سی روٹی کتے کے آگے ڈال دی، کتے نے کھایا اور اپنی دم ہلائی۔

یاشار نے کتے سے کہا: سمجھ گئے میرے دوست میں نے کیا کہا ہے؟

اس کے بابا بولے: اچھا یہ کیا کہہ رہا ہے یاشار؟

یاشار بولا: کہہ رہا ہے، پیارے یاشار کوئی چیز میرے دانتوں میں پھنس گئی ہے میری درخواست ہے کہ میرا منہ کھول کر اسے باہر نکال دو۔ بابا اور ماں تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ یاشار نے آہستہ سے کتے کا منہ کھولا اور اپنا ہاتھ اندر ڈالا کہ کتے کے دانتوں کے بیچ صاف کر دے۔ اچانک کتے نے ہاتھ پر مارا اور بھونکا، یاشار کی چیخ بلند ہوئی۔ بابا نے کتے کو لات ماری اور گھر سے باہر دھکیل دیا۔ یاشار کا ہاتھ کئی جگہ سے زخمی ہو گیا تھا اور وہ برابر آہ اوہ کر رہا تھا۔

اس دن یاشار نے اپنی اماں سے کہا: جانے کی اجازت ضرور دو گی نہ؟

اس کی اماں بولی: ہاں۔

یاشار نے کہا: تمہیں چاہیے کہ چارپائی کے تار والی لمبی رسی بھی مجھے دینا اماں!

ماں نے پوچھا: کس لیے چاہتے ہو؟ اب کیا مذاق کرنے لگے پیارے بیٹے۔

یاشار نے کہا: مجھے اپنے سفر کے لیے ضرورت ہے مذاق وزاق نہیں کر رہا ہوں۔

ماں حیران تھی، نہیں جانتی تھی کہ اس کا بیٹا کیا چاہتا ہے۔ آخر کار ساری کی ساری تاروں کی رسی یاشار کی ملکیت ہوئی۔ جب سونے جا رہے تھے تو یاشار نے کہا: اماں جان!

ماں بولی: ہاں بولو۔

یاشار نے کہا: وعدہ کرتی ہو یہ باتیں کسی سے نہ کہو گی؟

ماں بولی: تم اطمینان رکھو، میں کسی سے نہ کہوں گی لیکن تم جانتے ہو تمہارے بابا ہوتے تو یہ باتیں سن کر انہیں ہنسی آ جاتی۔ یاشار کچھ نہ بولا۔ گھر میں سوئے ہوئے تھے اور ستاروں کا آسمان میں چمکنا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔

## ● روانگی کا دن

کام تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یاشار کی اماں دن میں کھانے کے وقت بھی گھر نہیں آتی تھی۔ بچوں کو کام کرنے کا موقع زیادہ تھا۔ کوّوں نے اپنا آنا جانا کم کر دیا تھا۔ سوتیلی ماں بہت چوکنی رہتی تھی۔ بڑی اماں کہتی تھیں ہمارے لیے کم آنا جانا اچھا ہے ورنہ سوتیلی ماں کو پتہ لگ جائے گا اور سارا کام خراب ہو جائے گا۔

جولائی کا آخری ہفتہ تھا کہ جال تیار ہو گیا۔ بڑی اماں آئی، اسے دیکھا اور پسند کیا اور بولی: تم لوگوں نے بڑی محنت کی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس کا فائدہ اٹھائیں۔

یاشار اور اولدوز نے پوچھا، ہم کب روانہ ہوں گے؟

بڑی ماں بولی: اگر چاہتے ہو تو پھر کل ظہر بعد ہی۔

اولدوز اور یاشار نے کہا: جتنا جلدی ہو اتنا ہی اچھا ہو۔

بڑی ماں بولی: بس کل ظہر کے بعد انتظار کرنا۔ جب بھی سننا کہ دو عدد کوّے کائیں کائیں کر رہے ہیں تو جال اٹھا لینا اور چھت پر آ جانا۔

بچوں کا دل قابو میں نہ تھا۔ چاہتے تھے چل پڑیں، ناچیں۔ تھوڑی ادھر ادھر کی بات بھی کی اور بڑی اماں اڑ کر درخت پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہاں بیٹھ کر کائیں کائیں کرتی رہی۔ ٹلتی ڈولتی رہی اور راستہ کر دو راتی ہوئی چلی گئی۔

● جنھیں دلوں کا حال معلوم نہیں،

● کہتے ہیں کہ اولدوز پاگل ہو گئی ہے۔

رات آئی شام ہی سے اولدوز اپنے آپ ہنسے جا رہی تھی۔ سوتیلی ماں

کہہ رہی تھی، لڑکی دیوانی ہو گئی ہے کیا۔ بابا بھی پوچھتے تھے: میری بچی آخر کیوں ہنس رہی ہے؟ میں تو ہنسنے کی کوئی چیز یہاں نہیں دیکھ رہا ہوں۔

اولدروز کہتی تھی: میں خوشی سے ہنس رہی ہوں۔ سوتیلی ماں غصہ ہو رہی تھی۔ بابا پوچھ رہے تھے: کون سی خوشی؟

اولدروز کہہ رہی تھی: اوہ، میں یونہی ہنس رہی ہوں، کوئی بات نہیں ہے۔

سوتیلی ماں کہہ رہی تھی: چھوڑو اسے دیوانی ہو گئی ہے۔

## ● اچھی اور مہربان امّاں

سونے کا وقت ہو گیا تھا۔ یاشار نے اپنی ماں سے کہا: اماں کل ظہر کے وقت گھر میں رہ سکتی ہو؟

اس کی اماں بولی: مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟

یاشار بولا: ہاں ظہر کے وقت میں تجھے بتاؤں گا۔ میرے سفر کے بارے میں ہے۔

اس کی اماں بولی: بہت اچھا، میں ظہر کے وقت گھر لوٹ آؤں گی۔

ماں کو اپنے بیٹے کے کچھ کام کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ ٹھیک ہے وہ اپنے سفر کے بارے میں ابھی بھول گیا تھا لیکن پھر اسے یاد آیا۔ لیکن جانتی تھی کہ یاشار اچھا بیٹا ہے اور کوئی خراب کام نہیں کرے گا۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی دن میں جب کپڑے دھونے جایا کرتی تھی تو اس کا دھیان رکھتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ خود دھوبی بن جاتی تھی لیکن اس کے لیے کپڑے، پنسل اور کاپیاں خریدتی۔ اچھی اور مختنی اماں تھیں۔ یاشار بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے اسے دھوکا نہیں دیتا تھا اور نہ ستاتا تھا۔

## ● روانگی

## ● اولدروز قید میں

صبح ہوئی تھوڑی دیر بعد روانگی کا وقت ہونے والا تھا۔ وقت بہت

آہستہ گزر رہا تھا۔ یاشار گھر میں اکیلا تھا۔ اسے بالکل سکون اور قرار نہیں تھا۔ صحن میں ادھر ادھر جاتا اور اس کا خیال اپنی اماں اور اولدوز کی طرف لگا ہوا تھا۔ کئی دفعہ جال باہر نکالا اور آنگن میں پھیلا دیا۔ اس کے اوپر بیٹھا پھر اٹھا لیا اور اسی جگہ پر رکھ دیا۔

ظہر کے وقت اس کی اماں آگئی۔ انگور، روٹی اور پنیر خرید کر لائی تھی بیٹھ کر اپنا دن کا کھانا کھایا۔ یاشار اولدوز کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں منتظر تھی کہ اس کا بیٹا بات کرے۔ کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ یاشار سوچ رہا تھا اگر اولدوز نہ آسکی، پھر کیا ہوگا۔ سارا پروگرام گڑبڑ ہو جائے گا۔ اگر سوتیلی ماں میرے ہاتھ لگ جائے تو میں جانتا ہوں اس کے ساتھ کیا برتاؤ کروں گا۔ اس کے بال ہاتھوں میں پکڑ لوں گا۔ مکار! کیوں اولدوز کو میرے پاس نہیں آنے دیتی؟ اگر اس وقت کوؤں کی آواز سنائی دے جائے تو میں کیا کروں گا؟ ابھی تک اولدوز نہیں آئی۔ میرا دل سینہ سے باہر نکل پڑے گا

پانی لانے کا بہانہ بنا کر باہر صحن میں آیا۔ دیوار کی دوسری طرف سے اولدوز کے اماں اور بابا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سوتیلی ماں پانی گرا کر اپنا ہاتھ دھو رہی تھی۔ معلوم پڑتا تھا کہ بابا ابھی گھر میں آیا ہے۔ سوتیلی ماں کہہ رہی تھی۔ تم نہیں جانتے کہ تمہاری بیٹی میرے سر پر کونسی مصیبت لے آئی۔ آخر میں مجبور ہو گئی کہ اسے باورچی خانہ میں قید کر دوں۔

اسی وقت دو عدد کوّے تبریزی درخت پر آ بیٹھے۔ جیسے ہی یاشار نے انہیں دیکھا اس کا دل بیٹھ گیا۔ بس اولدوز کا کیا کرے؟ اپنی اماں کو اسے بلانے کو بھیجے، کہیں ایسا نہ ہو اس کی ماں نے اسے بالکل قید نہ کر دیا ہو!

کوّے اڑے اور نزدیک آگئے اور یاشار کے سر پر منڈلانے لگے۔ اس کی طرف مسکرائے اور توت کے درخت پر بیٹھ کر اچانک دونوں نے کائیں کائیں شروع کر دیا۔ کائیں... کائیں! کائیں... کائیں! کائیں... کائیں..!

کوّوں کی آواز ایک طرح جنگ کے نقارے کی طرح تھی اور سن کر ذرا بھی معلوم ہوتا تھا اور حرکت اور جوش بھی۔ ایک لمحہ کے لیے یاشار کے

ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر ہوش میں آیا اور خاموشی سے کھٹی کی کوٹھری کی طرف گیا۔ جال اٹھایا اور چپکے سے چھت پر چلا گیا۔ بابا اور ماں اندر گئے تھے کوّے آئے اور یاشار کے پاس بیٹھ کر حال چال پوچھنے لگے۔ یاشار نے جال پھیلا دیا ابھی اولدوز نہیں آئی تھی۔ آدھا منٹ گزر گیا۔ یاشار نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ بائیں ہاتھ کی طرف بہت دور ایک کالی چیز چل رہی تھی اور اڑ رہی تھی۔ کوّوں میں سے ایک بولا: شاید آ ہی رہے ہیں۔ اولدوز کیوں نہیں آ رہی ہے!

یاشار بولا: میں نہیں جانتا شاید سوتیلی ماں نے اسے قید کر دیا ہے۔

کالی چیز اور قریب آ گئی۔ ایک کھٹی ہوئی کائیں کائیں کی آواز سنائی دی پھر بھی اولدوز نہیں آئی۔ کوّے آ گئے۔ ہزاروں کوّوں کی کائیں کائیں سے آسمان بھر گیا۔ سارے چھت اور دیوار کالے کوّوں سے کالے ہو گئے۔ شہتوت کے درخت پر کوئی جگہ خالی نہ رہ گئی۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ سب پر خوف طاری تھا۔

یاشار کی ماں اپنے سر پر ایک پتیلی رکھے ہوئے آنگن میں کھڑی تھی اور چلا رہی تھی۔ یاشار کہاں غائب ہو گیا، تیری آنکھیں نکال لیں گے . . .

جب یاشار نے اپنی ماں کی آواز سنی، چھت کے کنارے آ کر بولا: اماں ڈرو نہیں یہ میرے دوست ہیں: اگر مجھے چاہتی ہے تو جا کر اولدوز کو چھت پر بھیج دو۔ اماں میری درخواست ہے۔ چلی جاؤ اماں ہم دونوں کو سفر پہ جانا ہے۔

ماں حیران چپ اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی اور کچھ نہیں بول رہی تھی۔ یاشار نے ایک بار پھر التجا کی۔ چلی جا ماں! میں منت کرتا ہوں، کوّے ہم دونوں کے دوست ہیں ..... ان سے ڈرو نہیں۔

یاشار نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔ بس رونے ہی والا تھا بڑی اماں سامنے آ کر بولی: تم جاؤ اور جال میں بیٹھ جاؤ میں خود جیتر کوّوں کو لے کر اولدوز کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔ دیکھوں کہاں رہ گئی۔

کوّوں کی آواز نے بہت سے لوگوں کو آنگن میں جمع کر دیا تھا۔ ہر کسی نے کوئی نہ کوئی چیز اپنے سر پر ڈال رکھی تھی بڑی اماں بولی: کوّو! لپٹ جاؤ ان میاں بیوی کو اور بالکل ہلنے نہ دینا۔

کوّے بابا اور ماں کے سر پہ ٹوٹ پڑے، پتلیاں ٹھن ٹھنا رہی تھیں اور بابا اور سوتیلی ماں کو ڈرا رہی تھیں۔

بڑی اماں چند کوّوں کے ساتھ اندر گئی۔ اولدوز کے چلّانے کی آواز باورچی خانہ سے آ رہی تھی۔ باورچی خانہ کا دروازہ تالے سے بند تھا۔ اولدوز چھری سے کرید کر دروازہ میں سوراخ کر رہی تھی اور ایک چھوٹا سا سوراخ بنا لیا تھا۔ اس وقت یاشار کی اماں وہاں پہنچ گئی۔ کوّوں نے راستہ خالی کر دیا ماں نے پتھر مار کر تالا توڑ دیا۔ اولدوز باہر آئی۔ ماں نے اسے سینہ سے لگا لیا اور چوما۔ اولدوز بولی: اماں، ہمارا انتظار نہ کرنا ہم لوگ جلد لوٹ آئیں گے۔ سوتیلی ماں سے بھی نہ بتانا کہ تم نے مجھے باہر نکالا۔ تجھے ستائے گی۔

یاشار کی اماں رو رہی تھی، اولدوز دوڑی مرغیوں کے ڈربے سے ایک تھیلا نکالا اور چھت پر آ گئی۔ کوّوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جس وقت یاشار کے پاس پہنچی تو اپنے آپ کو اس کے سامنے گرا لیا۔ یاشار نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور اپنے سینہ پر دبایا اور خوشی سے رونے لگا۔

بڑی اماں نے یاشار کی اماں کا شکریہ ادا کیا، چھت پر آئی اور چلّا کر بولی: کوّو! چل پڑو روانہ ہو جاؤ۔

اچانک کوّے جوش و خروش میں مصروف ہو گئے۔ چونچوں اور پنجوں سے جال کو پکڑا اور اٹھا لیا۔ یاشار نے کچھ دھاگے جال کے کنارے باندھ رکھے تھے۔ کوّوں نے انھیں بھی پکڑ رکھا تھا۔ یاشار اوپر سے چیخا: اماں ہم لوگ چلے، میرا سلام بابا کو پہنچانا۔ غصہ نہ ہونا، ہم جلدی لوٹیں گے۔

کوّوں نے بابا اور ماں کو ان کے حال پر چھوڑا اور چل پڑے۔ وہ دونوں آنگن کے بیچ میں کھڑے ہانپنے والے بیمار سے تھے اور پتھر اور لکڑی پھینک رہے تھے۔ ان کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے اور بدن پر کئی زخم

بھی آگئے تھے۔ آخر کار شہر سے دور ہو گئے۔

ہزاروں کوّے بچوں کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ صرف ان کے سر کے اوپر کی جگہ خالی تھی۔ اولدوز نے ایک نگاہ بادلوں پر ڈالی اور اپنے آپ سے بولی: کتنے خوبصورت ہیں۔

کوّے شور مچا رہے تھے اور چلے جا رہے تھے۔

کوّوں کے شہر جا رہے تھے۔

ایسی جگہ جا رہے تھے جو بابا کے گھر سے اچھی تھی۔

اس جگہ جا رہے تھے جہاں سوتیلی ماں نہ تھی۔

## ● چوسنیوں کو پھینک دو!

## ● دوستوں کی یاد میں شہادت اور ناکامی!

بڑی اماں، خانم کوّی اور کوّے جناب آئے اور بچوں کے ساتھ بیٹھ گئے تاکہ کچھ بات چیت کریں اور پھر بعد میں دوسروں کی طرح کام میں لگ جائیں۔

اولدوز نے اپنا بقچہ کھولا۔ ایک کرتا باہر نکالا اور یاشار سے کہا: یہ بابا کا ہے۔ میں تمہارے لیے لے آئی۔ تم بعد میں اسے پہننا۔

یاشار نے شکریہ ادا کیا۔

بقچے کے اندر تھوڑا مکھن اور روٹی بھی تھی۔ اولدوز نے چند روپے اپنی جیب سے نکالے اور بڑی اماں کو آواز دیتے ہوئے بولی۔ بڑی اماں کوّے مرحوم کے پر یہیں ہم نے اس کی یادگار کو بچا رکھا تھا کہ تم کو دیں گے میں اور یاشار کوّے جناب اور ان کی اماں کو کبھی نہیں بھولیں گے وہ دونوں ہمارے لیے مارے گئے۔

بڑی اماں نے پر لے لیے، ہوا میں اڑی اور جب کہ کوّوں کے اور بچوں کے سر پر اڑ رہی تھی، زور زور سے بولی: میں تمہاری اجازت سے دو تین باتیں کہنا چاہتی ہوں۔

کوّے چپ ہو گئے۔ بڑی اماں نے ایک چوسنی اپنے پروں کے اندر

سے نکالی اور بولی: میرے پیارے ساتھیو! میں ابھی کوی ہوں ابھی ابھی اولدوزنے چندر پر کوے جناب کے پچھے دیے۔ ہم ان کو بچا کر رکھیں گے کیونکہ وہ اپنی ماں کی تنہا نشانی اور مہربان اور قربان ہو جانے والا بیٹا تھا۔ یہ پر ہمیں یاد دلائیں گے کہ ہم بھی اچھے اور قربان کوے بنیں۔

اولدوز اور یاشار نے واہ واہ بلند کی۔

کوّوں نے زور زور سے کائیں کائیں کی۔

بڑی ماں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: لیکن اس چوسنی کو ہم پھینک دے رہے ہیں اس لیے کہ اسے سوتیلی ماں نے اولدوز کے لیے خریدا تھا تاکہ وہ ہمیشہ اسے چوستی رہے اور کبھی بولنے کے لیے زبان نہ کھول سکے اور اپنا دل تکلیف کو کسی سے نہ کہہ سکے۔

اولدوز نے اپنی چوسنی پہچان لی وہی جو اس نے بی کوی کو دی تھی۔ بڑی اماں نے چوسنی کو نیچے گرا دیا۔ کوّوں نے شور مچایا۔ بڑی اماں نے کہا: سوتیلی ماں نے بی کوی کو مار ڈالا: کوے جناب کو ختم کر دیا لیکن اولدوز اور یاشار نے انھیں نہیں بھلایا۔ پس وہ بچے "زندہ باد" جو کبھی شہید اور ناکام دوستوں کو نہیں بھلا سکے۔

کوّوں نے اور زیادہ زور سے کائیں کائیں کی۔ اولدوز اور یاشار نے تالیاں بجائیں اور آوازیں لگائیں۔

- ان پہاڑوں کے اوپر
- کوّوں کی بستی
- پہاڑی کوّے

دور سے اونچے پہاڑ نظر آئے بڑی اماں نیچے آئیں اور بولیں: ان پہاڑوں کے اوپر کوّوں کی بستی ہے تعجب نہ کرنا کیونکہ ہم کوّوں نے پہاڑ پر بسیرا کیا ہے کوے رنگا رنگ کے ہیں

○

آخر جان (قصہ خانہ) جلیل، پایپر

## دوستوں کا خط

یہ بھی بچوں کا ایک محبت بھرا خط ہے جنھوں نے "اولدوز اور کوّے" کا
قصہ چھپنے سے پہلے سن لیا تھا اور چپ نہ رہ سکے تھے۔ ان بچوں کے خطوط استاد
کے ذریعہ کہانی لکھنے والے کے پاس آئے ہیں۔

ہم اولدوز کے دوستوں کو سلام بھیجتے ہیں۔ جو کوئی ہمارے پاس اولدوز
کی کوئی خبر لائے گا ہم اسے مبارک باد دیں گے۔ ہم لوگ اولدوز، کوّوں اور
یاشار کی طرف سے فکر مند ہیں۔ ہمارے پاس کافی صابن ہے اور اسے ہم
اولدوز کو دینا چاہتے ہیں۔ ہم موسم بہار کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم کبھی کوّوں
کو نہیں ستائیں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ مائیں بی کوّی جیسی ہوں۔ بی کوّی ماں تھی
ہم اس کو عزیز رکھتے ہیں۔ بی کوّی اپنے شوہر کی دوست تھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ
ہماری مائیں، ہمارے باباؤں کی عزیز رہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ کوشا اولدوز اور
یاشار لڑائی لڑنے گئے ہیں۔ لڑائی لڑیں گے باباؤں اور اپنی سوتیلی ماؤں
سے۔ ہم یاشار کے لیے تیر و کمان بنائیں گے۔ ہم کوّوں کے گھونسلے اب نہیں
اجاڑیں گے تاکہ کوّا جناب اس کے اوپر بیٹھے اور جب کبھی سوتیلی ماں آئے،
بابا آئے تو اولدوز کو خبر کر دے۔ ہم اولدوز کو جوتا اور کپڑا دیں گے اور
مچھلیوں کو چرائیں گے اور مکڑوں کو پکڑ کر جمع کریں گے۔ کوّا جناب خوشخبری
لائے گا وہ جنگ میں کامیاب ہوں گے یاشار اور اولدوز کا ہاتھ تھامے گا۔ وہ
دونوں آئیں گے۔ اولدوز ایک اچھی ماں بنے گی اور یاشار مہربان باپ
بنے گا ہم انکی شادی میں تالیاں بجائیں گے ہم ان کے لیے اور تمام سب کے لیے فکرمند
اور منتظر ہیں ہم ان کی مدد کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ
سب کوّوں کی بستی سے جلد از جلد لوٹ آئیں۔

اولدوز کے، یاشار کے اور کوّوں کے ساتھی
پہلی کلاس کے ۲۸ لڑکوں کے نام اور دستخط
دولتی امیر کبیر، آذر شہر ۱۳/۱۱/۲۲ ۔ ۱۳ جنوری ۱۹۶۸ء

# اولدوز اور بولتی گڑیا

## بولتی گڑیا کی چند باتیں

بچو، سلام! میں اولدوز خانم کی بولتی گڑیا ہوں۔ جن بچوں نے اولدوز اور کوّوں کی کہانی پڑھی ہے وہ مجھے اور اولدوز کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ میری اور اولدوز کی کہانی اولدوز اور کوّوں کی کہانی سے پہلے کی کہانی ہے۔ اس وقت کی جبکہ سوتیلی ماں کو اولدوز کے بابا کے گھر میں آئے ہوئے دو سال سے زیادہ نہیں ہوا تھا اور اولدوز کی عمر چار پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس وقت مجھے بات کرنا نہیں آتا تھا۔ اولدوز کی ماں نے مجھے اپنی پرانی شال اور برقع کے کپڑوں سے بنایا تھا اور اپنے سر کے بالوں سے میرا سینہ، پیٹ، ہاتھ اور پیر ظاہر کیا تھا۔

ایک رات اولدوز نے مجھے اپنے سامنے رکھا اور مجھ سے بولتی رہی، بات کرتی رہی اور اپنا دکھڑا بیان کرتی رہی۔ اس کی باتوں نے میرے اوپر اتنا اثر کیا کہ میں بولنے لگی اور اس سے بات چیت کرنے لگی اور اب بھی مجھے بات کرنی بھولی نہیں ہے۔

میری اور اولدوز کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ جناب "بہرنگ" نے یہ کہانی اولدوز کی زبانی سنی تھی اور کہانی بنا دی تھی۔ کچھ دن پہلے لکھی ہوئی کہانی لے کر میرے پاس آئے اور بولے: بولتی گڑیا، میں نے تمہاری اور اولدوز کی کہانی لکھ ڈالی ہے اور چاہتا ہوں کہ اسے چھاپ دوں۔ اچھا ہے کہ تم بھی اس کہانی کے بارے

میں کچھ لکھ دو۔

میں نے جناب "بہرنگ" کی لکھی ہوئی کہانی کو شروع سے آخر تک پڑھا اور دیکھا کہ صحیح صحیح کہانی بنا ڈالی ہے لیکن چند جملے فارسی زبان کی قواعد کے مطابق نہیں ہیں۔ پس میں نے پنسل ہاتھ میں لی اور ان کے جملوں کی اصلاح کر دی۔
اب اگر پھر بھی جملوں، ترکیبوں، کلموں اور محاوروں کے استعمال میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو پھر قصور میرا ہے۔ ان بیچارے کو قصوروار نہ سمجھیے کیونکہ فارسی زبان نہیں جانتے ہیں۔ شاید انھیں بھی کچھ اچھا نہیں معلوم ہوگا کہ ایسی زبان میں کہانی لکھیں جو وہ نہیں جانتے۔ لیکن پھر بھی اس کا علاج ہی کیا ہے؟ ہاں؟

میری آخری بات یہ ہے کہ کوئی لاڈلا اور گھمنڈی بچہ میری اور اولدوز کی کہانی پڑھنے کا حقدار نہیں ہے۔ خاص طور سے امیر بچے جو کاروں میں بیٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو سڑک پر پیدل چلنے والے بچوں اور غریب بچوں سے بلند اور بڑا سمجھ کر فخر سے سر اونچا کرتے ہیں اور کام کرنے والے بچوں کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ جناب بہرنگ نے خود ہی کہا تھا کہ وہ اپنی کہانی انھیں غریب اور معذور اور بے سہارا بچوں کے لیے لکھتے ہیں۔

البتہ بڑے اور معذور بچے بھی اپنے خیالات ٹھیک کر کے اور اپنا برتاؤ اچھا بنا کر جناب بہرنگ کی کہانی پڑھیں، اور وعدہ بھی کیا ہے۔

سمجھدار بچوں کی سہیلی بولتی گڑیا۔

## ● گڑیا بولتی ہے:

موسم ہلکا اندھیرا تھا۔ اولدوز بکس رکھے جانے والے کمرہ میں بیٹھی تھی۔ اپنی سوئی گڑیا کو سامنے رکھے ہوئے تھی اور دھیرے دھیرے بول رہی تھی ......
... میری سوئی گڑیا ٹھیک جاننا چاہتی ہے۔ دنیا میں صرف تو ہی میری ہے۔ میری اماں کو پوچھتی ہو؟ مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ میرے پڑوسی کہتے ہیں کہ بہت پہلے بابا نے اماں کو طلاق دے کر گاؤں میں نانا کے پاس بھیج دیا۔ میں سوتیلی ماں کو بھی پسند نہیں کرتی ہوں۔ جس وقت سے وہ ہمارے گھر میں آئی ہیں

میرے بابا کو بھی مجھ سے چھین لیا ہے۔ میں اس گھر میں اکیلی ہوں۔ میری گائے کو بھی کل مار ڈالا۔ وہ ہمارے درمیان سب سے اچھی تھی۔ میں اس سے بات کرتی تھی اور وہ میرا ہاتھ چاٹتی تھی اور اپنا دودھ پلاتی تھی۔ جب تک مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی کسی کو دودھ دوہنے نہ دیتی۔ بچپن سے ہی ہمارے گھر میں تھی۔ میری اماں نے اپنے ہاتھوں سے اسے جنم دلوایا اور بابا نے پالا تھا۔ میری اچھی گڑیا! تو آج تک کہاں باہر میں چلی!.... ہاں میں نے تجھے بتایا نہ کہ کل میری گائے کو ذبح کر ڈالا۔ سوتیلی ماں نے میری پیاری گائے کا گوشت کھانے کی خواہش کی اور وہ اب اس کی بہن باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی ہیں اور منتظر ہیں کہ گوشت پک جائے اور وہ کھائیں۔ ۔ ۔ یہ چڑیلیں میری ہستی کو کھا جائے!.... میں جانتی ہوں تو حسد کی آگ میں نہ جلے گی۔ بڑی گڑیا! یا تو بات کر ورنہ پھر میں کہوں۔ غصے سے مری جا رہی ہوں..... میری سوتیلی ماں جب سے دوسرے بچے کی امید سے ہوئی ہے مجھے دیکھنا نہیں چاہتی ہے۔ کہتی ہے: جب تیرا چہرہ دیکھ لیتی ہوں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے ہاتھ میں نہیں رہ جاتا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنا سارا وقت بکس لے کر بیٹھی توشہ خانے میں گزار دوں تاکہ ماں میری صورت نہ دیکھے اور اس کا دل نہ گھبرائے۔ میری بھدی گڑیا! یا تو منہ سے کچھ پھوٹ یا پھر میں رو دوں..... مجھے بالکل نہیں یاد کہ تو کب سے میرے پاس ہے۔ میں نے آنکھ کھولتے ہی تجھے دیکھا ہے۔ اگر تو بھی میرے ساتھ ہر گھڑی رہی غصہ کرتی رہی۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا کروں۔۔ میری بڑی گڑیا۔ بول یا میں پاگل ہو جاؤں!.... تجھے پریشان کروں میری گڑیا!..... بڑی گڑیا۔ میں رو رہی ہوں۔ بول.... بات کر.... بات

اچانک اولدوز نے محسوس کیا کہ کوئی ہاتھ اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو پونچھ رہا ہے اور چپکے سے کہہ رہا ہے: اولدوز، اب بہت ہو چکا۔ مت رو، اب تو نہیں رونے کی۔ میں بولنے لگی.... میری آواز سن رہی ہے۔ تمہاری موٹی گڑیا بولنے لگی اب تو اکیلی نہیں ہے۔

اولدوز نے اپنے پاس ایک طرف جھک کے غور سے دیکھا کہ اس کی موٹی

گڑیا اولیور کے پاس سے اٹھ آئی اور اس کے سامنے بیٹھ کر اپنے ایک ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھ رہی ہے۔ بولی: گڑیا! تو بول رہی تھی؟ بولتی گڑیا نے کہا: میں پھر بات کروں گی۔ میں تمھاری زبان جانتی ہوں۔

موسم اندھیرا ہو گیا تھا اور اولیور اپنی گڑیا بڑی مشکل سے دیکھ پاتی تھی۔ چپکے چپکے پر قدم وہ توشہ خانہ سے باہر آئی اور طاق پر دیا سلائی تلاش کرنے لگی تاکہ چراغ جلا دے۔ لیکن چراغ کے پاس ماچس نہ تھی۔ چراغ زمین پر رکھا اور پنجا کر دوسرے طاق پر سے ماچس اٹھا کر لائے۔ یکایک اس کا سر ٹکرایا اور چراغ لیے وہ زمین پر آ رہی۔ اس کا شیشہ چکنا چور ہو گیا اور بتی فرش پر گر پڑی۔ تیل کی مہک سارے کمرے میں پھیل گئی۔ اسی وقت دروازہ کھٹکھٹایا گیا، اولیور گھبرا گئی۔ گڑیا جو توشہ خانہ کی چوکھٹ تک آ گئی تھی بولی: اندر آ جاؤ! اولیور بہتر ہے کہ تم خود کچھ نہ بتانا اور کہہ دینا کہ تم نے تو اپنا پیر توشہ خانہ سے باہر ہی نہیں نکالا ہے۔

گلی کے دروازہ کے کھلنے، بابا اور سوتیلی ماں کے بولنے کی آواز سنائی دی ماں آگے آگے چلی آ رہی تھی اور کہہ رہی تھی: میں باورچی خانہ میں تھی۔ چراغ نہیں جلایا۔ ابھی جلاتی ہوں۔

گڑیا نے اولیور سے کہا: جلدی کر۔ اندر آ جا!

اولیور بولی: اچھا ہے میں یہاں کھڑی ہوں اور ماں سے بتاؤں کہ شیشہ ٹوٹ گیا ہے ورنہ پیر شیشے کے ٹکڑے پر رکھ دیں گے اور برا ہو جائے گا۔

جس وقت سوتیلی ماں اپنا پیر چوکھٹ سے اندر رکھ رہی تھی۔ اولیور نے ماچس جلائی اور بولی: اماں سنبھال کر۔ چراغ گر پڑا اور شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔

بابا بھی ماں کے پیچھے پیچھے آیا۔ ماں نے اولیور کو تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ بابا نے اسے پکڑ لیا اور دھیرے سے اس سے کہا: میں نے تم سے کہا ہے کہ کچھ روز اسے اور چھوڑ دو۔ ۔ ۔

کھانے زیج کرتے وقت اولیور اتنا بیتاب تھی اور روئی تھی کہ سب کہتے تھے کہ غصہ سے بے قابو ہو جائے گی۔ کل رات کا کھانا ابھی نہیں کھایا تھا اور

صبح تک بڑبڑاتی رہی تھی اور گڑگانے کی آواز منھ سے نکالتی تھی کیسی ہے۔ بابا نے ماں سے کہہ دیا تھا کہ چند دنوں تک لڑکی کو چھوڑ دے اور اس کے پیچھے نہ پڑے۔

سوتیلی ماں نے صرف یہ کہا: اس طرح کے ہاتھ پاؤں چلانے والی لڑکی میں نے تو آج تک دیکھی نہیں تھی۔ چراغ جلانا بھی نہیں جانتی ہے۔ اب میری آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جا!

اولدوز پھر توشہ خانہ میں چلی گئی۔ ماں نے دوسرا چراغ جلایا اور اپنے شوہر سے بولی: تیل کی بدبو سے میرا دل دھڑکنے لگا ہے۔

گرمیاں تھیں اور کھڑکی کھلی تھی۔ سوتیلی ماں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور اپنا سر اوپر اٹھایا۔ بابا نے اپنا لباس اتار کر شیشے کے ٹکڑے جمع کرنا شروع کیا تھا کہ ماں کی بہن اندر آئی اور بولی: باجی خانم! گوشت زہر کی طرح کڑوا ہو گیا ہے۔

سوتیلی ماں کھڑی ہو گئی اور بولی: کیا کہا! گوشت کڑوا ہو گیا؟

بڑی خانم نے گوشت کی ایک بوٹی ماں کی طرف بڑھا کر کہا: چکھو، دیکھو!

ماں نے گوشت کی بوٹی بہن کے ہاتھ سے چھین لی اور اپنے منھ میں رکھ لی۔ گوشت اتنا کڑوا اور پھیکا تھا کہ سوتیلی ماں کا دل پھر دھڑکنے لگا۔

"میں کیا بتاؤں" بابا، ماں اور بڑی خانم جلدی سے باورچی خانے بھاگے۔

اولدوز اور بولتی گڑیا توشہ خانہ کی دھیمی روشنی میں بات چیت میں مصروف تھیں۔ اولدوز کہہ رہی تھی: بس تم میری بولتی گڑیا۔ بڑی نے کیا کہا! بتایا کہ گوشت ان کے لیے زہر ہو گیا۔

بولتی گڑیا نے کہا: میرا خیال ہے کہ کاگے نے اپنا گوشت صرف ان کے لیے کڑوا بنا دیا ہے۔ تیرے منھ میں وہ کڑوا نہیں ہوگا۔

اولدوز بولی: میں کھاؤں گی۔

گڑیا بولی: اس کاگے کی ایک اور چیز بھی تمھیں حفاظت کے ساتھ رکھ لینا چاہیے۔ یقیناً وہ تمھارے کام آئے گی۔ اس قسم کی کاگیں بہت سی خصوصیات رکھتی ہیں۔

اولدوز نے پوچھا: تمھارے خیال میں میں کون سا حصہ کہاں چھپا کر حفاظت

سے رکھ دوں۔

گڑیا نے جواب دیا: اس کے پیر آنگن میں چھپا کر رکھ دینا۔

## • سوتیلی ماں کے لیے کڑوا
## • اولدوز کے لیے مزیدار

پھر بھی نماز میں بابا، سوتیلی ماں اور بڑی خانم چولہے کے چاروں طرف اکٹھا تھے اور گوشت کی بوٹیوں کو ایک ایک کر کے چکھ رہے تھے اور تھوک رہے تھے۔ ابھی بہت سا کچا گوشت کھونٹی میں لٹکا ہوا تھا۔ اٹھا کر رکھ دیا تھا کہ دوسرے روز قورمہ پکائیں گے۔ بابا نے ایک ٹکڑا اٹھا اور چکھا۔ کچا بھی کڑوا اور بدمزہ تھا۔ بولا: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرنے سے پہلے کیا کھا لیا تھا کہ اس طرح کڑوا ہو گیا۔

سوتیلی ماں بولی: کچھ نہیں کھایا تھا۔ لڑکی نے اپنی آنکھوں کا زہر اس کے چہرہ پر ڈال دیا۔ منحوس نے نہ جانے کیا کیا۔

بابا بولا: گائے کو بے کار ذبح کیا۔ میں نے تم سے کہا کہ رہنے دو میں قصائی سے گوشت خرید لوں گا لیکن تم نہ مانیں!

سوتیلی ماں بولی: گائے اب جائے جہنم میں۔ میں خود بیہوش ہوئی جا رہی ہوں۔ بدبو میرا دل دھڑکائے جا رہی ہے۔

بڑی خانم نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا: آؤ باہر چلیں۔

سوتیلی ماں نے بڑی کے کندھے کا سہارا لیا۔ گئی اور مسند کے پاس بیٹھ گئی اور کہا: اولدوز کو بلا لے اور اس گوشت کو لے جا کر کلثوم کے گھر دے آئے۔ بدبو سے سارا گھر بھر گیا ہے۔

کلثوم ان کے گھر کے بائیں طرف رہتی تھی۔ اس کا شوہر تہران میں کام کرتا تھا۔ بھٹوں میں اینٹ بنانے کا مزدور تھا۔ یاشار نام کا ایک چھوٹا بچہ بھی رکھتا تھا، جو مدرسہ جاتا تھا۔ وہ خود زیادہ تر گھروں میں کپڑے دھوتی تھی۔

بڑی کھڑکی کی طرف دوڑ گئی اور آواز لگائی: اولدوز! اولدوز! ماں کو تجھ سے کام ہے۔ یاشار کے گھر جانا ہے۔

اولدوز اپنی گڑیا کو یاشار کے بارے میں بتانے جا رہی تھی کہ پری خانم کی آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔

بولتی گڑیا بولی: اگر تم چاہتی ہو تو میرے بولنے کی خبر یاشار کو بھی سنا دو۔

اولدوز نے کہا: ہاں مجھے بتا دینا چاہیے۔

اس وقت صحن میں گئی۔ چراغ کی مدھم روشنی صحن کے گلیارے کو تھوڑا روشن کیے ہوئے تھی۔ ماں بیٹھی بیٹھی قے کر رہی تھی اور سر اوپر نیچے کر رہی تھی۔ بابا ناشتہ دان لے آیا تھا اور شہتوت کے پیڑ کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اس کی ہتھیلی ماں کی پیشانی پر تھی۔

پری نے اولدوز سے کہا: ناشتہ دان لے جا کر کلثوم کو دے آؤ۔

ماں بولی: اس لت خور بدشکل دراز کے پاس زیادہ نہ بیٹھنا، جلد لوٹ آ...

اولدوز بولی: ماں تم خود گوشت کیوں نہیں کھا رہی ہو؟

سوتیلی ماں نے بیتابی سے کہا: مگر کیا تو نے اپنی ناک میں روئی ٹھونس رکھی ہے، اس کی بدبو نہیں سونگھتی۔ اٹھائے جا اسے۔

پری نے ماں سے کہا: باجی آپا، پہلے ہی جب یہ گائے زندہ تھی تو اس کا گوشت کڑوا لگتا تھا۔ یہ گندی جانور تھی۔

بابا کچھ نہ بول رہا تھا۔ لوٹا اور اولدوز کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اولدوز گوشت کی بوٹیاں ناشتہ دان سے نکال رہی ہے اور مزے کے ساتھ چبا رہی ہے اور گھونٹ رہی ہے۔ فوراً چلایا اور بولا: بیٹی یہ نہ کھا۔ تھوک دے زمین پر۔

اولدوز نے کہا: ایسے لذیذ اور مزیدار گوشت کو کیوں نہ کھاؤں؟

پری بولیں۔ واہ، واہ، مردہ خوروں کی طرح جو کچھ آگے آتا ہے کھا رہی ہے۔

سوتیلی ماں بولی: وہ انسان تو ہے نہیں۔

اولدوز نے دوسری بوٹی منہ میں رکھی اور بولی: میں نے آج تک اتنا مزیدار گوشت کبھی نہیں کھایا ہے۔

ماں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پری خانم نے اپنا منہ بنا لیا، بابا حیران رہ گیا۔

اولدوز پھر بولی: کیا خوشبو! . . . . ۔ یہ تو مکھن اور مرغ کے گوشت کا مزہ دے رہا ہے اماں!

سوتیلی ماں جس نے اپنا منہ ہاتھ دھولیا تھا، اٹھ کھڑی ہوئی اور چل کر کمرے کے پاس آئی اور بولی ۔ اس قدر کھا کہ تیرا پیٹ اور معدہ پھٹ جائے اور باہر نکل آئے، میرا کیا ہے ۔

بابا بولا: اچھا اب بس کر بیٹی، بیمار ہو جائے گی، لے جا کے کلثوم کے کمرے میں آ۔

اولدوز بولی، صرف دو تین اور کھا لینے دو پھر . . . . .

بابا اور پری بھی اندر چلے گئے ۔ ماں کمرے میں ادھر ادھر آجا رہی تھی اور اپنا ہاتھ دل پہ رکھ کر رو رہی تھی ۔ بابا اور پری جب اندر آئی بولی، یہ بدبو ہر جگہ پھیل گئی ہے ۔

پری بولی: باجی آپا، تیل کی مہک ہے ۔

ماں بولی: یعنی میں اتنی گدھی ہوں کہ مٹی کے تیل کی مہک نہیں جانتی؟

ہائے میرا دل . . . . میرا معدہ باہر آجائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ آخ ۔ ۔ ۔

بابا بولا: پری خانم، اسے صحن میں لے جاؤ ٹھنڈی ہوا کھائے ۔

پری نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور صحن میں لے گئی ۔ اولدوز اب بھی شہتوت کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی مزے سے گوشت کھا رہی تھی اور واہ واہ کہہ رہی تھی اپنی انگلیوں کو چاٹ رہی تھی: ماں چلائی: ہاتھ پھر کی لونڈیا پھر میرا دل باہر نکلا جا رہا ہے ۔ میں نے کہا کہ اس بدبو کو گھر سے باہر لے جا ۔

اولدوز بولی: ماں بدبو کون سی اور کہاں سے ۔

سوتیلی ماں نے ناشتہ دان کو ایک لات ماری اور چلائی: میں تجھ سے کہہ رہی ہوں کہ یہ گلے سڑے کا گوشت اٹھا لے جا اور اس کی مہک دور کر ۔ ۔ ۔ ۔ میرا دل اور معدہ باہر آ رہا ہے ۔

اولدوز بولی: چند بوٹیاں اور کھا لینے دو میں بھوکی ہوں ۔

ماں نے اولدوز کا بال ہاتھوں میں پکڑ لیا اور سر پر تھپڑ مار کر بولی: مجھ سے مذاق کرنا چاہتی ہے ۔ کتیا ۔

بابا لوٹا اور بڑبڑاتا ہوا کھڑکی سے سر نکالتا ہوا بولا، اب کیا بات ہے؟

سوتیلی ماں بولی: تیرا زور تو صرف مجھ بدقسمت پر چلتا ہے۔ جھوٹ کہتی ہے کہ رہتے ہو، میں تو اس بدمعاش سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی، تم دیکھتے ہو کہ میرے ساتھ کتنی ڈھٹائی دکھا رہی ہے۔

اولدوز نے ناشتہ دان اٹھایا اور گلی کے دروازہ کی طرف گئی۔ دروازہ کے دوسری طرف ناشتہ دان زمین پر رکھ دیا اور زنجیر ہاتھ میں لے کر اپنا ایک پیر دروازہ میں ٹکا دیا اور اپنے آپ کو اوپر اٹھایا اور دروازہ کھول کر نیچے آئی۔ ناشتہ دان اوپر اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ سوتیلی ماں اس کے پیچھے چلائی: تو نے دروازہ بند نہیں کیا!

## ● سادہ اور محبت بھری بات چیت:

اس رات بابا، سوتیلی ماں اور بڑی خانم آنگن میں سوئے۔ اولدوز نے کہا: میں کمرے میں سوؤں گی۔

بابا نے کہا: بیٹی! تو جو ہمیشہ توشہ خانے تک میں اکیلے سونے سے ڈرتی تھی اب کیا ہو گیا ہے کہ تو تنہا سونا چاہتی ہے!

اولدوز بولی: مجھے سردی لگ رہی ہے۔

بڑی بولی: اتنا گرم موسم اور کہتی ہے مجھے ٹھنڈک لگ رہی ہے۔ بے چاری باجی آپا۔ تم ٹھیک کہتی ہو اسے دیکھنا تمہیں اچھا نہیں لگتا ہے۔

سوتیلی ماں بول پڑی۔ چھوڑو اس کو! اپنی موت کا کونڈا بھرے۔ وہ تو کوئی ہی نہیں ہے۔ شرم گوشت کھا رہی ہے اور کہتی ہے واہ واہ۔

جب یک بیک جھک جھک بند ہوئی، اولدوز نے دبی بولی گڑیا کو آواز دی۔ گڑیا آئی اور اولدوز کے لحاف میں گھس گئی۔ دونوں باتوں میں مگن ہو گئیں۔

گڑیا نے پوچھا: یاشار سے ملی؟

اولدوز بولی: ہاں ملی اُسے یقین نہیں آتا تھا تم بولنے لگی ہو چاہیے کہ کسی دن ہم تینوں بیٹھیں اور . . . .

گردیا نے کہا: اب جب کہ گرمی ہے اور یاشار اسکول نہیں جاتا ہے ہم مل کر صبح سے شام تک کھیلیں اور گھومیں۔

اولدوز بولی۔ یاشار۔ بیکار نہیں ہے، قالین بننے جاتا ہے۔

گردیا بولی: پھر اس کا بابا؟

اولدوز نے جواب دیا: تہران گیا۔ اینٹوں کے بھٹے میں کام کرتا ہے۔

گردیا نے کہا: اولدوز تجھے چاہیے جیسے بھی ہو اس گائے کے پیر کو ہمارے لیے جیب کر رکھ لو۔ وہ ایک عام گائے نہیں تھی۔

اولدوز بولی: میں بھی جانتی ہوں۔ جو کوئی اس گائے کا گوشت چکھتا تھا اس کا دل گھبرانے لگتا تھا۔ وہ تو میرے لیے مکھن، شہد اور مرغ کا مزہ رکھتا تھا یاشار اور اس کی ماں کو بھی مزیدار معلوم ہوا اور مزہ لے کر کھایا۔

گردیا بولی: یاشار کا حال اچھا تھا؟

اولدوز بولی: آج صبح کارخانے میں اس کا انگوٹھا چھری سے کٹ گیا اور بری طرح زخمی ہے کہ گرہ بھی نہیں باندھ سکتا ہے۔

اچانک سوتیلی ماں کی آواز بلند ہوئی۔ بیٹی اپنی آواز بند کر۔ ۔ ۔ آخر کیوں پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہی ہے۔ تجھے کچھ معلوم ہے تو کیا کہنا چاہتی ہے؟

بابا بولا۔ خواب دیکھ رہی ہے۔

ماں بولی۔ خواب تو اس کا دماغ کھا گیا ہے۔

گردیا نے آہستہ سے کہا: بہتر ہے کہ اب تم سو جاؤ۔

اولدوز پھسپھسا کر بولی: مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ میں تجھ سے بات کرنا چاہتی ہوں، کھیلنا چاہتی ہوں۔ تم کہانی کہنا چاہتی ہو؟

گردیا بولی: ابھی تھوڑا سو لے، میں پھر تمہیں جگاؤں گی۔ میں تجھے اور یاشار کو جنگل لے جانا چاہتی ہوں۔

اولدوز پھر کچھ نہ بولی اور چپ لیٹ گئی اور کھڑکی میں سے آسمان میں نگاہیں گاڑ دیں۔ تاکہ ٹوٹتے اور گرتے ہوئے تاروں کا تماشا کرے۔

## • جنگل کی رات
## • رات جو خواب کی طرح تھی
## • اور آسمان کی پشت معلوم ہوتی تھی

آدھی رات بیت چکی تھی۔ چاند پہاڑوں کے پیچھے سے نکل رہا تھا۔ زمین پر ہوا ٹھہری ہوئی تھی اور چلتی نہ تھی لیکن اوپر نرم ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ تین سدھ سفید کبوتر اس ہوا میں اڑ رہے تھے، اچھل رہے تھے اور آہستہ آہستہ اڑتے ہوئے مگن تھے۔ چاندنی رات میں پورا شہر ان کے بازوں اور پاؤں کے نیچے سو رہا تھا۔ ایک کبوتر کے ٹوٹے ہوئے پر دھاگے سے بندھے ہوئے تھے۔ بعض گھروں کی چھتوں پر بھی لوگ سوئے ہوئے تھے، ایک لڑکا جاگا اور اپنی ماں سے بولا: ماں کبوتروں کو دیکھو ایسا ہوتا ہے وہ اپنا راستہ بھول گئے ہیں۔

ماں گہری نیند کا مزہ لے رہی تھی اس لیے نہیں جاگی۔ لڑکے کی آنکھیں آزردہ کے ساتھ کبوتروں کا پیچھا کر رہی تھیں اور خود بھی اسی طرح دیکھتے دیکھتے گہری نیند سو گیا چاند اوپر آنے والا تھا اور سائے اور چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ اب کبوتر شہر کے کافی دور نکل گئے تھے۔ پر ٹوٹے ہوئے کبوتر نے بیچ والے کبوتر سے کہا: بولشی گرد یا، جنگل بہت دور ہے؟

بیچ والے کبوتر نے جواب دیا: نہیں پیارے یاشار ان پہاڑوں کے بیچ میں جن کے پیچھے سے چاند نکلا ہے، کہیں تم تھک نہ گئے ہو۔

یاشار، اسی ٹوٹے ہوئے پر والے کبوتر نے کہا: نہیں بولشی گرد یا، مجھے اڑتے ہوئے اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ میں کتنا ہی اڑوں تھکتا نہیں ہوں۔ میں گرمیوں میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں اپنے پتنگ پر سوار ہوں اور اڑ رہا ہوں۔

تیسرا کبوتر بولا: میں بھی ہر رات خواب دیکھتا ہوں کہ میرے پر لگ گئے ہیں اور میں اڑ رہا ہوں۔

بیچ کے کبوتر یعنی بولشی گرد یا نے کہا: مثلاً کس طرح؟

تیسرے کبوتر نے کہا: میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں نے شہد کا ڈبہ اٹھا لیا ہے اور سارا کا سارا کھا لیا ہے۔ سوتیلی ماں کو معلوم ہوا اور میرے پیچھے پڑ گئی اس کے ہاتھ میں ایک دست پناہ بھی تھا۔ میں نے کتنا ہی زور لگایا کہ دوڑوں لیکن نہیں دوڑ سکی۔ میرے پیر پتھر ہو گئے تھے اور پیچھے چلتے جاتے تھے بہت تھوڑا باقی رہ گیا تھا کہ سوتیلی ماں میرے پاس پہنچ جائے کہ یکایک میں فضا میں بلند ہو گئی اور پر پھڑ پھڑانا شروع کر دیا اور دور ہوتی ہوئی اس چھت سے اس چھت پہ گئی ــ ماں نیچے سے چلا رہی تھی اور میرا پیچھا کر رہی تھی۔

یاشار بولا، پھر اس کا انجام؟

اولدوز بولی: آخر اچانک ماں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے پیر پکڑ لیے اور نیچے کی طرف کھینچا۔ میں نے ڈر سے چیخ ماری اور نیند سے جاگ پڑی۔ میں نے دیکھا کہ صبح ہو گئی تھی اور ماں میرے پیر کی انگلیاں پکڑ کر ہلا رہی ہے اور کہہ رہی ہے: اٹھو! دھوپ نکل آئی ہے اور تو ابھی سو رہی ہے۔ یاشار او دلوتی گرد یا ہنسے اور بولے عجیب خواب!

پھر دلوتی گرد یا بولی: آخر تم نے سوتیلی ماں کے ساتھ کیا برائی کی ہے کہ نیند تک میں تمھارے سر پر سے اپنا سر نہیں اٹھاتی ہے؟

اولدوز بولی: میں کیا جانوں۔ ایک روز میرے بابا سے کہہ رہی تھی کہ جب تک میں اس گھر میں ہوں، بابا سے عزیز نہیں رکھ سکتا بابا بھی قسم کھا رہا تھا کہ وہ ہم دونوں سے محبت کرتا ہے۔

یاشار بولا: میں چاہتا ہوں چند قلا بازیاں کھیلوں

گرد یا بولی: ہم تینوں قلا بازی کھائیں گے۔

اس رات وہاں کے آس پاس رہنے والے گڈریوں نے آسمان میں کیا دیکھا کہ دو تین کبوتر بڑی بے پرواہی کے ساتھ آسمان میں اڑتے ہوئے قلا بازی کھا رہے ہیں، بات کر رہے ہیں، ملاقات کر رہے ہیں اور کوئی تھکتا بھی نہیں ہے۔

اچانک یاشار بولا: اوہ . . . ٹھہرو، میرا زخم کھل گیا ہے۔

گڑیا اور راولدروز نے دیکھا کہ پاشار کے ٹوٹے ہوئے پر سے خون ٹپک رہا ہے گڑیا نے اپنے سینے سے چند چیتھڑے نوچے اور پاشار کے زخم کو دوبارہ باندھ کر بولی: جیسے ہی ہم جنگل میں پہنچیں گے، تمھارے زخم پر مرہم لگائیں گے۔ اس وقت جلد اچھا ہو جائیگا۔

اب وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکے تھے۔ پہلے تو ایک تنگ درّہ نظر آیا جس کے منہ پر بلند پہاڑوں کے سرے ملے ہوئے تھے اور دہانے کو اور پتلا بنا دیا تھا۔ کبوتر درّہ میں آ تر آئے۔ پاشار نے گڑیا سے پوچھا:

بولتی گڑیا! تم نے ہمیں کچھ نہیں بتایا کہ ہم لوگ جنگل کس کام سے جارہے ہیں؟

گڑیا نے جواب دیا: آج رات ساری گڑیاں جنگل میں اکٹھا ہو رہی ہیں چند مہینوں کے بعد ہم لوگ یہ جلسہ کرتے ہیں۔

اولدروز نے پوچھا۔ کس لیے جمع ہوتے ہیں؟

گڑیا بولی: ہم لوگ جمع ہوتے ہیں کہ دیکھیں آیا لڑکوں اور لڑکیوں کا حال اچھا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ہم لوگ بھی خوشی اور جشن منانا چاہتے ہیں۔

درّہ طے ہو گیا اور جنگل شروع ہو گیا۔ لمبے لمبے سروالے درخت کھڑے ہوئے تھے اور چاندنی میں چمک رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک درختوں کے اوپر بھی اڑان جاری رہی یہاں تک کہ جنگل کے بیچ میں پہنچ گئے۔ بات چیت کا شور کانوں کو سنائی دیا۔ ایک بڑا حصہ بغیر درختوں کے تھا جس کے ایک کنارے سے ایک جوہڑ شروع ہوتا تھا اور درختوں کو گھیرے میں لیے ہوئے گزرتا تھا۔ چاروں طرف طرح طرح کے بڑے اور لمبے درخت سیدھے کھڑے ہوئے تھے اور رنگ برنگے پرندے ان کے اوپر بیٹھے ہوئے چہچہا رہے تھے، یا بسیرا کر رہے تھے۔ جوہڑ کے کنارے آگ روشن تھی جس کی سرخ روشنی تمام جنگل میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیکڑوں اور ہزاروں چھوٹی بڑی گڑیاں یہاں وہاں آ جا رہی تھیں یا گروہ گروہ جمع ہو کر کہیں بیٹھ کر گپیں ہانک رہی تھیں۔ بڑی اور چھوٹی، بھڑکیلے اور معمولی کپڑے پہنے، طرحدار اور سادہ غرض ہر قسم کے گڈے گڑیاں مل گئی تھیں۔

اس رات جنگل کے جانور بھی نہیں سوئے تھے۔ درختوں کے گردا گرد
اپنی اچھی جگہیں تلاش کر کے بیٹھ گئے تھے اور گڑیوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔
پاشا اور اولدوز ان گڑیوں، جانوروں اور پرندوں کو دیکھ کر
مزے لے رہے تھے۔ کسی بچے نے خواب میں بھی ایسی چیزیں نہیں دیکھی ہے۔ چاند
جوہڑ کے پانی میں دیکھا جا رہا ہے۔ درخت، پرندے اور آگ کی لو بھی نظر آ رہی
تھی۔ تمام چیزیں خوبصورت تھیں، سب چیزیں مہربان تھیں، اچھا لگ رہا
تھا، سب چیزیں، تمام چیز پسند کے قابل تھی۔

## • دم دار مور اور گھمنڈ کی باتیں:

مور اکیلا درخت پر بیٹھا ہوا اپنی دم لٹکائے ہوئے تھا۔ بولتی گڑیا
نے پاشا اور اولدوز سے کہا: آؤ تمھیں مور کے پاس لے چلیں۔ اس سے بات
چیت کریں۔ میں تو سارا کے پاس جا رہی ہوں، میں نے تمھیں کو بلایا ہے۔
گڑیوں کے سامنے آ رہے ہو تم۔
اولدوز نے پوچھا: یہ سارا کون ہے؟
گڑیا نے بتایا: یہ ہماری بزرگ ہیں۔
گڑیا نے بچوں کو مور سے ملوایا اور خود اپنی سہیلیوں کے پاس چلی گئی
مور بولا: بس تم لوگ بولتی گڑیا کے دوست ہو۔
اولدوز بولی: ہاں، وہ ہمیں یہاں گڑیوں کے جشن کا تماشا دکھانے لائی ہے
پاشا بولا: مور تم کس قدر خوبصورت ہو؟
مور بولا: ابھی تم نے مجھے دیکھا ہی کہاں ہے! میری دم غور سے دیکھو
پاشا اور اولدوز نے دیکھا کہ مور کی دم آہستہ آہستہ اوپر
آئی، اٹھی اور بڑی چھتری کی طرح کھل گئی، چاند اور آگ کی روشنی
میں مور کے پر ہزاروں رنگ بدل رہے تھے۔ بچوں کے منہ حیرت سے کھلے
کے کھلے تھے۔
مور بولا: ہاں، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو میں بہت خوبصورت پرندہ

ہوں۔ دیکھتے ہو میں نے اپنی دم سے کتنا خوبصورت طاق بنالیا ہے۔ سارے پنچھی میرے ایک پر کے لیے جان دیتے ہیں۔ تمام شاعروں نے میرے حسن اور نزاکت کی تعریف کی ہے مثال کے طور پر سعدی شیرازی فرماتے ہیں:

جو خوبی مور میں موجود ہے        اسی بنا پہ سبھی اس کے پر کو چومتے ہیں

یہاں تک کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ حکیم ابو علی سینا نے میرے گوشت اور چربی کی بڑی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ بہت کی بیماریوں کا علاج بھی ہیں۔ شاعر سورج کی مشابہت مجھ ہی سے کرتے ہیں اور اسی لیے اسے "سنہرے پروں والا مور" کہتے ہیں۔ چند پرانی کتابوں میں میرا نام ابوالحسن بھی لکھا ہے۔ میں اپنی مادہ سے بھی زیادہ خوبصورت ہوں ....

پاشار مور کی بڑبڑاہٹ سے پریشان ہو گیا تھا، لیکن چونکہ خیال تھا کہ اس کے دو تین پر اس سے مانگ لے مور کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ آخر کار مور کی بات بیچ میں کاٹی اور بولا: پیارے مور! اپنے خوبصورت پروں میں سے دو ایک مجھے اور اولدوز کو دو گے؟ میں چاہتا ہوں اپنی کتابوں میں ان کو رکھوں۔

مور ٹھٹک گیا اور بولا: نہ، میں اپنے قیمتی پروں کو اپنے بدن سے الگ نہیں کر سکتا۔ یہ تو میرے بدن کا حصہ ہیں، مگر کیا تم اپنی آنکھیں نکال کر مجھے دے سکتے ہو؟

اولدوز جس کا خیال زیادہ تر گڑیوں اور جانوروں کی طرف تھا، اور جو مور کی باتوں کو غور سے نہیں سن رہی تھی، اسی لیے پاشار نے پہلے دیکھ لیا کہ بولتی گڑیا ان کو آواز دے رہی ہے۔ گڑیا نے اپنی کمال اتار لی تھی اور اب وہ کبوتر نہیں تھی۔ اولدوز نے مڑ کر دیکھا کہ پاشار بری طرح بدمزہ ہے: بولی، پاشار آؤ ہم لوگ نیچے چلیں، بولتی گڑیا ہمیں آواز دے رہی ہے۔

مور کو خدا حافظ کہا، پر کھولے اور اڑ کر نیچے آ گئے۔ مور نے اس وقت تک اپنی دم کو اوپر ہی اٹھا رکھا تھا اور اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا کہ کہیں

اس کا خراب پیر دیکھ نہ لیا جائے جب دیکھا کہ بچے جانا چاہتے ہیں تو بولا: خوش آمدید مجھے امید ہے کہ تم یہاں کہیں بھی جاؤ گے مجھے نہ بھلاؤ گے اور میرے حسن کی تعریف کرو گے۔

## • سارا اور دوسری گڑیوں سے جان پہچان

بولتی گڑیا نے ایک ہاتھ پاشار اور اولدوز کے سر اور چہرے پر پھیرا اور انھیں کبوتر کے پنجرے سے باہر نکالا: آدمی بالشت کی ایک ننھی گڑیا ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بولتی گڑیا نے اس سے کہا: سارا میرے دوست یہ لوگ ہیں اولدوز اور یاشار۔

یاشار اور اولدوز نے سلام کیا۔ سارا کھڑی ہو گئی۔ بچے جھک گئے اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

سارا بولی: ہمارے جشن میں آنا مبارک ہو۔ میں تمام گڑیوں کی جانب سے تم لوگوں کو خوش آمدید کہتی ہوں۔

یاشار بولا: ہم کو بھی بہت فخر ہے کہ بولتی گڑیا کی محبت کو ہم نے پایا ہے اور ہم بہت خوش ہیں کہ آپ لوگوں نے ہمیں اپنے جلسہ میں آنے کا موقع دیا ہے اور ہمارے ساتھ اپنی سہیلیوں جیسا برتاؤ کر رہی ہیں۔

سارا نے کہا: اول تو آپ کو خود اپنا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے اپنے اخلاق اور محبت بھرے برتاؤ سے گڑیا کو بولنا سکھا دیا اور اس جنگل میں آسکے ہیں۔

پھر اپنا منہ بولتی گڑیا کی طرف کرتی ہوئی بولی: بچوں کو لے جاؤ اور دوسری گڑیوں سے ملوا دو اور سب سے کہو کہ میرے پاس آئیں ہم تھوڑی گفتگو کریں گے اور پھر اپنا ناچ شروع کر دیں گے۔

جب سے گڑیوں نے سن رکھا تھا کہ بولتی گڑیا اپنے دوستوں کو بھی لے آئی ہے، وہ سب کی سب گروہ گروہ آگے آتی جاتی تھیں، بچوں کو گھیرے میں لے لیتی تھیں اور خوش آمدید کہنا، محبت کرنا اور بات کرنا شروع کر دیتی تھیں۔

## • گھنڈی کتنے پیچ ہیں۔

یاشار کی انگلی کا درد بڑھ گیا تھا۔ گڑیا کا ہاتھ پکڑا اور بولا: میری انگلی بری طرح درد کر رہی ہے، ایک کام کرو۔

گڑیا بولی: میں بالکل ہی بھول گیا تھا، اچھا کیا مجھے یاد دلا دیا۔

ایک موٹی گڑیا سامنے آ کر بولی: یاشار تم کو چوٹ آ گئی ہے؟

یاشار بولا: ہاں گڑیا خانم: میرا انگوٹھا چاقو سے کٹ گیا ہے۔

اولدوز نے بتایا: قالین بننے کے کارخانے میں۔

بڑی گڑیا بولی: آؤ ہم جنگل چلیں: میں ایک مرہم جانتی ہوں جو زخم کو تھوڑی دیر میں ٹھیک کر دیتا ہے۔ آؤ۔

پھر یاشار کا ہاتھ پکڑا اور کھینچا۔

بولتی گڑیا بولی: جاؤ یاشار، ہمراہ گڑیا ہے اور گھاس پھوس والی دواؤں کو اچھی طرح جانتی ہے۔

دونوں گڑیوں کے بیچ میں سے گزرے اور درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ جنگلی جانوروں نے راستہ دے دیا۔ ایک سفید خرگوش ایک گھاس کا ڈنٹھل چبانے ہی جا رہا تھا، گڑیا اس سے بولی: خرگوش دوست: کیا تم اس جنگل کے کنارے سے میرے لیے ان پھیلی ہوئی اور چوڑی پتیوں والے درخت سے دو پتے لا سکتے ہو؟

خرگوش نے پوچھا: اب کس کا زخم باندھو گی؟

گڑیا بولی: یاشار کا زخم باندھنا ہے، ہمیں چنار کے درخت کے نیچے ہم لوگ بیٹھے ہیں۔

خرگوش نے پھر کچھ نہیں کہا، اور سیدھا کھڑا ہوا اور دوڑا اور جنگل کے پیچ دار راستوں میں گم ہو گیا۔ گڑیا نے چند طرح کی پتیاں اور گھاس جمع کی اور چنار کی جڑ کے پاس بیٹھ کر ایک پتھر پھیلا کر پتیاں کوٹنی شروع کر دیں۔

دوسری گڑیاں اب یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھیں، صرف آگ

کی لو تھوڑی بہت درختوں اور پتوں کے درمیان دکھائی دے رہی تھی ۔

یاشار بولا: گڑیا خانم، تم مور کو پہچانتی ہو؟

گڑیا بولی: بہت اچھی طرح سے پہچانتی ہوں، ایک اچھا اور شاندار کبھی بھولا نہیں سکتا ۔

یاشار بولا: بولتی گڑیا ہم کو اس کے پاس لے کر چلو تاکہ ہم اس کے ساتھ گفتگو کریں لیکن وہ خود ہی سب اپنے بارے

گڑیا نے کہا: بولتی گڑیا تم کو ان کے پاس لے گئی کہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ گھمنڈی کتنے کھیلے ہیں ۔

یاشار نے بتایا: میں نے اس سے کہا کہ اپنے دو تین پر دے تاکہ میں اپنی کتابوں کے بیچ میں رکھوں، نہیں دیا اور کہا کہ اس کے پر اتنے سستے نہیں ہیں جتنا کہ میں سوچ رہا ہوں ۔

بڑی گڑیا جس طرح کہتی اور گھاس کو ٹھیک رہی تھی بولی: گھمنڈ کرتا ہے۔ کبھی دن تو اس کے پر جھڑنے کے ہیں۔ اس وقت جس قدر تم چاہتے ہو لے سکتے ہو ۔

یاشار بولا: سچ مچ؟

گڑیا نے کہا: مور انہیں دنوں میں اپنے پر جھاڑ دیتا ہے ۔

یاشار نے کہا: اس وقت کیا لنڈورا ہو جاتا ہو گا ۔

گڑیا بولی: ارے کھوسٹ اور بدصورت، خاص طور سے جب کہ اپنے پیر بھی چھپا نہیں سکتا ہے ۔

## • جنگل کی اندھیری راتیں
## • اور
## • جگنو

یاشار کی آنکھیں جنگل کی اندھیاری میں گم تھیں کہ اس نے دیکھا کہ ایک ننھی سی روشنی گھاس کے بیچ سے دھیرے دھیرے ان کی طرف چلی

آرہی ہے۔ گڑیا سے کہا: گڑیا خانم، وہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟

گڑیا نے ادھر دیکھا اور بولی: جگنو ہے، مہربان کیڑا ہے جو اندھیرے میں روشنی دکھاتا ہے۔ ایسا ہی جیسے ہمارے پاس آرہا ہے۔ یعنی نہیں چاہتا ہے کہ ہم تاریکی میں رہیں۔

گڑیا اور یاشار نے یہاں تک انتظار کیا کہ جگنو نزدیک آگیا اور کہا، سلام! گڑیا بولی: سلام، جگنو میاں، کہاں جانا چاہتے ہو؟

جگنو بولا: میں جنگل کے اندھیرے میں گھومنا چاہتا ہی تھا کہ تمھاری آواز سنائی دی، اور میں نے اپنے آپ سے کہا۔ میں جو کہ تھوڑی سی روشنی رکھتا ہوں کیوں ان لوگوں کے پاس نہ جاؤں؟

گڑیا نے شکریہ ادا کیا اور یاشار کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ ہم یاشار کی چوٹ کے لیے مرہم بنا رہے ہیں۔ اچھا لڑکا ہے اس سے ملاقات کرو۔

یاشار اور جگنو باتوں میں مشغول ہو گئے۔ یاشار نے قالین بننے و مدرسہ جانے اور اپنی اماں اور ابا کے بارے میں اس کو بتایا اور اس نے بھی جنگل، درختوں اور جانوروں اور رات کے اندھیرے کے بارے میں بات چیت کی۔ بڑی گڑیا نے بھی مرہم کوٹ پیس کر تیار کر دیا، پھر جا کر ایک درخت سے ایک پھول توڑ کر لائی، اس کا رس نکالا اور اس سے یاشار کا زخم دھویا اور پونچھ پانچھ کر صاف ستھرا کر دیا۔

- کوئی روشنی کتنی ہی معمولی ہو
- آخرکار روشنی ہے۔

کچھ منٹ بعد خرگوش واپس آگیا۔ دو عدد نرم چوڑے پتے اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھا۔ انھیں گڑیا کو دیا۔ جب اس کی نگاہ جگنو پر پڑی، سلام کیا اور بولا: عجیب دوستانہ محفل جمی ہے!

جگنو بولا: خرگوش دوست، میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ دوسروں کی اندھیری زندگی کو روشن کروں، جنگل کو روشن کروں۔ اگرچہ

بعض جانور میرا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں، جنگل کے تنہا پھول سے بہار نہیں آتی ہے۔ تم بے کار کوشش کر رہے ہو کہ اپنے ذرّہ بھر نور سے جنگل کو روشن کرنا چاہتے رہو؟

خرگوش بولا: یہ باتیں پرانے لوگوں کی ہیں، ہم بھی کہتے ہیں، کوئی روشنی کتنی ہی کم کیوں نہ ہو آخر کار روشنی ہی ہے۔

ثریا نے مرہم کو زخم پر ملا اور پٹی اس کے اوپر لپیٹ دی تھی، خرگوش نے اس سے پوچھا: ثریا خانم علاوہ کوئی کام مجھ سے ہے!

ثریا بولی: ایک کام اور بھی تھا، مور چنار کے پیڑ پر جو جھرنے کے کنارے بیٹھا ہوا ہے۔ آج کل اس کے پر جھڑنے کے دن ہیں، جا کر کوئی ایسا کام کر کہ اچانک مور ہل جائے اور اس کے دو ایک پر گر جائیں۔ اس وقت انھیں اٹھا کر لے آ۔ ہم پاشار کو دیں گے۔ چاہتا ہے کہ اپنی کتاب کے اوپر رکھے۔

خرگوش چھوڑ کر چلا گیا، جگنو نے کہا: یہ وہی گھمنڈی مور ہے!

ثریا بولی: ہاں۔

پاشار نے کہا: اپنے پروں پہ بہت ناز کرتا ہے۔

جگنو نے کہا: دوست پاشار ثریا خانم کو دیکھتے ہو کیسا رنگا رنگ خوبصورت لباس پہن رکھا ہے، اس کا ہر حصّہ مور سے زیادہ خوبصورت ہے اس کی جلد میں ذرّہ برابر غرور اور نمائش نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے اگر وہ اپنا لباس بدل لے یا اتار دے پھر بھی ہم اسے عزیز رکھیں گے۔ یہ بھی بری نہیں ہے کیا لباس میں اور کیا بغیر لباس کے۔

پاشار نے درختوں کے بیچ کی روشنی اور تاریکی میں اپنی ٹانگوں کے پیوند دار پاجامے پر ہاتھ پھیرا اور ایک نظر اپنی پھٹی آستینوں اور ننگے پیروں اور پھٹی ایڑیوں پر ڈالی اور کچھ نہیں بولا۔

ثریا بولی: پاشار تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں مور کی مانند اپنے رنگا رنگ لباس میں قید ہوں۔ یہ میرے گھر ہی میں بنا ہے اور مجھے پہنایا گیا ہے آخر میں ایک امیر گھرانے میں زندگی گزار رہی ہوں، لیکن تم ثریا ہمارے گھر کو بھی طرح جانتی ہے؟

گڑیا نے اپنے دامن میں سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور یاشار کا ہاتھ باندھ دیا۔ اٹھ کر چلیں جگنو بول پڑا: میں یہیں رہوں گا جب تک کہ خرگوش دوست لوٹ نہ آئے میں تم لوگوں کے پیچھے اسے بھیجوں گا۔

گڑیا اور یاشار ابھی درختوں کے بیچ سے نکلے بھی نہیں تھے کہ خرگوش انکے پاس پہنچ گیا۔ سویرے کے روپہلے سمے میں ادھ پائے ہوئے تھا۔ یاشار نے پیروں کو لیا اور آگے چل پڑے۔

## ● دنیا کا بہترین رقص

پانی کے جوہڑ کے کنارے گڑیوں کا بڑا رنگ سارا کچھ بول رہی تھی اور دوسری گڑیاں خاموشی سے سن رہی تھیں، اور لدو ایک کنارے پر کھڑی ہوئی تھی۔

سارا کہہ رہی تھی: میں اس سے زیادہ آپ کے لیے دردِ سر نہیں بنوں گی۔ ہم دوسری گرمیوں کے بیچ پھر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ میں اپنی تقریر کے آخر میں پھر ایک بار اپنے عزیز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اپنی مہربانیوں اور اچھائیوں سے اپنی گڑیا کو بولنا سکھا دیا ہے ہم سب کو معلوم ہے کہ اب تک کوئی بچہ اس قابل نہ ہو سکا تھا کہ اپنی گڑیا کو بولتا بنا دے مجھے امید ہے کہ لدو، یاشار اور ان کی گڑیا کی دوستی ہمیشہ قائم رہے۔ اب ہم اپنے عزیز مہمانوں کے اعزاز میں گلاب کے پھول کا ناچ شروع کرتے ہیں۔

سب نے سارا کی تقریر کے خاتمہ پر تالیاں بجائیں۔ بولتی گڑیا نے بچوں کو ایک اونچے پتھر پر بٹھایا اور بولی: یہیں بیٹھو اور ناچ دیکھو۔ گلاب کے پھول کا رقص دنیا کا بہترین ناچ ہے۔

- ## گلاب کا ناچ
- ## گلاب کا گیت

ایک دن کے بیچ میدان خالی تھا۔ درختوں کے چاروں طرف ان کے نیچے جانور بیٹھے ہوئے تھے اور پرندے پیڑوں کے اوپر۔ اور دوسری کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ پھر باجے کی دھیمی اور میٹھی آواز سنائی دی اور بنفشی لباس پہنے دس بیس گڑیاں ہاتھ میں باجے لیے سامنے آئیں اور دھیرے دھیرے آکر ایک کونے میں کھڑی ہو گئیں۔ پھر جوہڑ کی تہہ سے ایک سفید برف جیسی عجیب کشتی ظاہر ہوئی جو باجے کی آواز پر چل رہی تھی اور سامنے آ رہی تھی۔ سفید پوش گڑیاں کشتی میں بھی خاموش بیٹھی ہوئی تھیں اور پانی کے ہلکوروں کی نرم گت سنائی دے رہی تھی۔ سفید مرغابیاں اور بطخیں آگے پیچھے سے کشتی کو چلا رہی تھیں اور لال چھوٹی مچھلیاں ان مرغابیوں کے گرد اگرد تیر رہی تھیں اور دائیں بائیں اچھل رہی تھیں۔ چاند بھی پانی میں تیر رہا تھا۔ جونہی کشتی پانی کے کنارے پہنچی، سفید گڑیوں نے ناچتے ہوئے زمین پر قدم رکھا، مرغابیاں، بطخیں اور مچھلیاں پانی کی جبہ پر بازو باندھ لی۔ گڑیاں اپنا پورا بدن اور ہاتھ ہلا رہی تھیں اور آہستہ ناچ رہی تھیں۔ ہر ایک نے گانا شروع کر دیا۔ ان کے لباس کا کنارا زمین کو چھو رہا تھا۔ ناچتی تھیں اور ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی تھیں، مسکراتی تھیں اور دو دو تین تین کر کے پھر ناچنے لگتی تھیں، دھیرے دھیرے دوسری بھی آ کر ان میں شامل ہو گئیں اور گانا شروع کر دیا۔ موسیقی کی آواز جنگل میں بھر گئی تھی۔

گڑیاں اس طرح گا رہی تھیں۔

ایک دن کسی زمانہ میں،
اس نیلے پانی کے کنارے،
گلاب کا ایک پھول کھلا ہوا تھا،
سخت،
خوبصورت،

پچھوا ہوا،
ہوا چلی،
بارش بھی آ گئی!
برفباری ہوئی!
طوفان آیا!
گلاب کا پھول اپنی جگہ سے گر پڑا،
اس کی پنکھڑیاں بکھر گئیں،
کہاں گئیں؟
ان کا حشر کیا ہوا!
مر گئیں، زندہ ہیں!
کوئی نہیں جانتا!
آہ کیا خوبصورت گلاب تھا!

سفید لباس والی گڑیاں گاتی ہوئی ناچتی ہوئی بنفشی لباس والی گڑیوں کی بغل میں کھڑی ہو گئیں، تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی لال گڑیا درختوں کے پیچھے سے ناچتی ہوئی آئی۔

سفید گڑیوں نے گانا شروع کیا:
ہم اسے پہچانتے ہیں:
گلاب کی پنکھڑی ہے،
کہاں سے آ رہی ہے؟
اور کہاں جا رہی ہے؟
کوئی نہیں جانتا ہے!

لال گڑیا تھوڑا ادھر اور ادھر جھکی اور چاہا کہ ایک کونے سے نکل جائے کہ ایک دوسری لال گڑیا سے ٹکرا گئی، دوسری گڑیوں نے پھر گانا شروع کیا:
ایک اور دوسری گلاب کی پنکھڑی،
کہاں سے چلی آ رہی ہے؟

اور کہاں جائے گی؟
کوئی نہیں جانتا ہے!

دوسری لال گڑیا بھی اس طرف اور اس طرف ٹھمکی اور ایک طرف نکل جانا چاہتی تھی کہ وہ تیسری لال گڑیا سے ٹکرا گئی۔ ایک لمحہ کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر تیزی اور خوشی سے ناچنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر ناچتی رہیں، پھر ایک چوتھی سرخ گڑیا ان سے آن ملی پھر دوسری، پانچویں، دسویں یہاں تک کہ سیکڑوں بڑی چھوٹی سرخ گڑیاں آگئیں۔ گروہ در گروہ دائرے بنا لیے تھے اور ناچتی رہیں، تیز اور زور دار رقص۔ چاند ٹھیک ان کے سر پر تھا۔ آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

پھر موسیقی کی آواز اور زیادہ تیز ہو گئی۔ گڑیوں نے ہاتھ بھی چھوڑ دیے تھے اور پھر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ اور جوہڑ کے کنارے اکٹھا ہو گئیں۔

اولدوز اور یاشار پتھر پر بیٹھے تھے اور ایسا ناچ دیکھنے میں محو ہو گئے تھے کہ بس نہ پوچھیے۔ یاشار تو مور کے پر بھی بھول گیا تھا۔ اچانک دیکھا کہ جوہڑ کے کنارے گلاب کا ایک پھول کھلا، بہت خوبصورت، تازہ گلاب ناچنے اور چرخ لگانے لگا۔ سفید لباس والی گڑیوں نے پھول کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور انھوں نے بھی ساتھ میں چکر لگانا اور ناچنا شروع کر دیا۔

رقص کی آواز آہستہ آہستہ تیز سے تیز ہوتی گئی اور بچے اس قدر جوش میں آگئے تھے کہ کھڑے ہو گئے اور ہاتھ میں ہاتھ دیے جا کر گڑیوں کا دائرہ توڑ بیٹھے۔ جانور اور پرندے بھی جوش و خروش میں آگئے تھے۔

گڑیاں ناچیں، ناچتی رہیں، پھر سب تتر بتر ہو گئیں اور میدان خالی ہو گیا۔ چند لمحوں بعد پھر گڑیاں اپنی پرانی پوشاک میں ملبوس ہو گئیں۔

اب چلنے کا وقت آگیا تھا۔ چاند آہستہ آہستہ پھیکا پڑ رہا تھا۔

## • کبوتروں کی آمد و رفت

## • وہ پہیلی جسے سوتیلی ماں کبھی نہ بجھا سکی

فضا تھوڑی اجالی ہو چلی تھی۔ سوتیلی ماں نے آنکھ کھولی، دیکھا کہ تین سفید کبوتر شہتوت کے درخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ذرا ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ان میں سے ایک اڑا اور سیا شاد کے گھر گیا اور باقی دونوں روشندان سے اندر چلے گئے۔ ماں نے کتنا ہی انتظار کیا لیکن کبوتر باہر نہیں آئے اس کی حیرت اڑ گئی۔ اٹھ کر گئی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اولاد دونا اور دلاس کا گڑیا دونوں سو رہے ہیں اور کوئی دوسری چیز کمرے میں نہیں ہے۔ بہت تعجب میں تھی۔ تھوڑا ڈر بھی گئی۔ اندر نہیں جا سکتی تھی۔ چند منٹ اسی جگہ کھڑی رہی اور پھر پریشان ہو کر آئی اور اپنے لحاف میں گھس گئی۔ لیکن اب بھی اس کی نگاہیں کھڑکی کی طرف تھیں اور کان کھنٹی کی طرف لگے ہوئے تھے تھوڑی دیر بعد ایک بے جانی پہچانی آواز کمرہ میں سے سنائی دی پھر ایک دوسری کھسر پھسر کرتی ہوئی آواز نے اس کا جواب دیا۔ ایسا جیسے دو آدمی آپس میں بات چیت کر رہے ہوں۔ سوتیلی ماں ڈر سے پسینے پسینے ہو گئی اور مستقل اپنی نگاہیں کھڑکی پر گڑو دئے ہوئے تھی۔ کھسر پھسر کرنے کی آواز دوبارہ کانوں میں سنائی دی۔ اس بار ماں نے اپنا نام خود بھی سنا اور بہت ڈر گئی۔ اپنے شوہر کو جگایا اور بولی: چلو جاکر دیکھو کوئی کمرے میں ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

بابا بولا: بی بی، سو جاؤ۔ اس وقت صبح صبح کون آتا ہے کہ لوگوں کے گھر میں چوری کرے؟

سوتیلی ماں بولی: چور نہیں ہے۔ ایک دوسری چیز ہے، دو کبوتر کمرے کے اندر گئے اور پھر باہر نہیں آئے۔

بابا اپنی بیوی کی وجہ سے اٹھا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ اولادوہ

اپنی گڑیا کو گود میں لیے سو رہی ہے۔ لوٹا اور اپنی بیوی سے کہا: دیکھا تم نے
صرف تمہارا وہم ہے۔ تو نے تو کبوتروں کو کبھی خواب ہی میں دیکھا ہے۔
اٹھو سماوار کو آگ پر رکھو، یہ بچکانہ خیال سر سے نکال دو۔
ماں اٹھ کر باورچی خانہ گئی تا کہ آگ جلائے۔ بابا نے لوٹا اٹھایا اور پاخانے
کا رخ کیا۔ پری خانم ابھی محو خواب تھیں۔ اگر جاگتی ہوتی تو یقیناً دیکھتی کہ
ایک سفید کبوتر پاشار کے گھر سے اوپر آیا اور ان کے روشندان میں سے ان
کے گھر میں گھس گیا اور بعد میں بھی کھسر پھسر کی آواز آتی رہی۔
سوتیلی ماں سماوار لیے دہلیز سے گزر رہی تھی کہ اس نے یہ بات چیت
سنی۔ ایک آواز نے کہا: بولتی گڑیا اٹھ جا اور مجھے کبوتر کے لباس سے باہر
کرو۔ پھر دوسری آواز آئی: اچھا ہوا کہ تو آ گیا۔ میں بالکل ہی بھول گیا
تھا کہ تو کبوتر کے بھیس میں اپنے گھر گیا۔ آگے آ میں تجھے اس بھیس سے باہر کروں
پہلی آواز بولی: ہمیں اپنے گھر جانا چاہیے، یہاں نہیں ہوگا۔
دوسری آواز بولی: ہاں اڑ چلو ہم چلیں، مجھے یہاں نہیں دیکھا جانا چاہیے
سوتیلی ماں معلوم ہو رہا تھا پاگل ہو جائیگی، ڈر سے ایک چیخ ماری
اور صحن کی طرف بھاگی۔ بابا حوض کے کنارے اپنا منہ ہاتھ دھونے ہی جا
رہا تھا کہ دو سفید کبوتروں کو اڑ کر کھڑکی سے اندر جاتے ہوئے اور باہر
آ کر ہوا میں ادھر ادھر اڑتے دیکھا۔ پھر بائیں طرف پڑوسی کے صحن میں جا کر بیٹھ گئے۔ بابا
نے کبوتروں کو دیکھا اور اپنی بیوی سے پوچھا: اب کیوں واویلا مچا رہی ہے؟ شاید کبوتروں
سے ہی تو ڈر رہی تھی وہ بھی ابھی ابھی اڑ گئے۔
پری شور و غل سن کر اٹھ بیٹھی۔ ماں نے آگ دان دیوار کی طرف
کھڑا کیا اور بولی: پھر باتیں کر رہے تھے، یہ "جن" تھے۔
پری بیچاری دنگ رہ گئی تھی۔ بابا اور ماں ایک اور دو کر رہے تھے اور دیکھ نہیں رہے تھے
کہ ایک سفید کبوتر چھت کے چھجے کے نیچے چھپ کر چوری چوری اندر گھس جانا چاہتا ہے۔ یہ
کبوتر بولتی گڑیا تھی جو پاشار کے پاس سے لوٹ رہی تھی۔ جب دیکھا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا
ہے تو روشندان سے اندر چلا گیا۔ لیکن ماں نے پروں کی آواز سن کر سر اٹھایا اور اسے

دیکھتے ہی چلائی ۔ وہی دیکھو پھر ایک اندر گیا۔

بابا کھڑکی کی طرف دوڑ کر گیا اور دیکھا کہ کبوتر توشہ خانہ میں داخل ہو گیا۔ بابا خود بھی توشہ خانہ میں پہنچا لیکن کوئی چیز نہ پائی ۔ حیران اور پریشان رہ گیا کہ آخر یہ گرد اور کبوتر کہاں چھپ گیا ۔ اچانک اس کی نگاہ بولتی گڑیا پر پڑی جو دروازے کے پیچھے سر کے بل پڑی تھی ۔

اولدوز ایسی سوئی تھی جیسے معلوم ہوتا تھا کہ کئی دنوں اور راتوں کی جاگی ہوئی سوئی ہے اور کبھی نہیں جاگے گی ۔ بابا نے ایک نظر اس پر ڈال اور اس کا لحاف الٹ دیا اور پھر معلوم ہوا کہ وہ اکیلی ہے ۔ اس کو یہ فکر تھی کہ آخر گڑیا کو کون لے گیا اور توشہ خانہ کے دروازے کے پاس رک گیا۔ سری اور سوتیلی ماں کھڑکی کے سامنے سے بابا کو اشارہ کر رہی تھیں ماں نے کہا، لڑکی کی گڑیا کہاں گئی ؟ میں نے آ کر دیکھا تو اس کی بغل میں تھی ۔

بابا نے کہا : توشہ خانہ کے اندر ہے ، کبوتر بھی نہیں ہے ۔

- سوتیلی ماں نے کہا ، میرے خیال میں یہ گڑیا کوئی شے ہے ؟ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے سر پر کوئی مصیبت نہ لا دے ۔ ۔ ۔

ماں نے کوئی دعا پڑھی اور اپنے اوپر پھونک کر پھر بولی ۔ اب تم لڑکی کو جگاؤ ۔

بابا نے پیر کی انگلیوں سے اولدوز کو ٹھوکر لگائی اور کہا ، اٹھ جا بیٹی !

## • یاشار امام کی نذر کیا گیا

یاشار کی اماں ظہر کے وقت اپنے گھر لوٹی تو دیکھا کہ یاشار ابھی سو رہا ہے ۔ کلثوم صبح سے اب تک اولدوز کی سوتیلی ماں کے پاس تھی ، کپڑا دھویا تھا اور گائے کے پھینک جانے والے گوشت کو لے جا کر کتوں کے سامنے ڈال آئی تھی ۔ فضا گرم تھی ، یاشار کو زیادہ پسینہ آ گیا تھا اور اپنا لحاف اٹھا کر پھینک چکا تھا ۔ بائیں کروٹ سویا ہوا تھا اور اپنے زانو کو اپنے پیٹ میں دبائے ہوئے تھا ۔ اس کی ماں نے دیکھا کہ اس کے زخم کا پھاہا بدلا ہوا تھا وہ کپڑا نہ

تھا جس کا مرہم اس نے چپکایا تھا۔ یہ تو ایک نیلے رنگ کا ریشمی کپڑا تھا۔ یاشار کو ملا یا۔
یاشار نے آنکھ کھولی اور پوچھا: ماں، مجھے کیا تھوڑا اور سونے دے گی۔

اس کی ماں بولی: بیٹا اٹھ جاؤ، ظہر کا وقت ہو گیا۔ تو کب سے اس قدر کاہل ہو گیا ہے؟ یہ نیلا کپڑا کہاں سے لا کر اپنا زخم باندھ لیا ہے؟

یاشار نے اپنے انگوٹھے کے زخم پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔ پھر اچانک اسے تمام چیزیں یاد آ گئیں۔ ایک لمحہ کشمکش و تشویش میں مبتلا ہو گیا اور اس کی ماں سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی کے ماتھے کے پسینے کو اپنی چادر سے پونچھا اور بولی: تو نے بتایا نہیں کہ یہ تازہ اور صاف کپڑا کہاں سے لایا؟

یاشار بولا: میں نے خواب دیکھا کہ ایک نورانی آدمی آئے اور میری بغل میں بیٹھ کر مجھ سے بولے، میرے بیٹے تم چاہتے ہو کہ تمہارے زخم کو ٹھیک کر دوں۔ میں نے کہا ہاں کیوں نہیں چاہتا ہوں جناب۔ وہ نورانی صورت اپنی جیب سے ایک مرہم نکال لائے، میرے زخم کو دوبارہ باندھ دیا۔ جب تک تو جاگے گا تیرا زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

یاشار ایک لمحہ کے لیے چپ ہو گیا اور پھر بولا: بڑا مہربان آدمی تھا اس کی صورت ایسی نورانی تھی کہ پوچھو نہیں۔ جس وقت میرے زخم پر مرہم رکھا مجھ سے کہا دیکھ تیرے پیچھے کون سی چیز کھڑی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کوئی چیز نہیں تھی لیکن جب میں نے ان کے سامنے پھر نگاہ کی تو کچھ نہ تھا۔ وہ جا چکے تھے۔

یاشار کی ماں اپنے بیٹے کو اتنی حیرانی سے دیکھ رہی تھی کہ بالکل ہل نہیں رہی تھی اور یاشار اسے دیکھ کر ڈر سا گیا پھر جب اس کی ماں کے ہونٹ ہلے تو سمجھ گیا کہ اسے عجیب ڈر لگا۔

اس کی ماں بولی: تو نے کہا اس آدمی کی صورت نورانی تھی؟

یاشار بولا: ہاں، ہاں ٹھیک ویسی جیسی اس روز تو بتا رہی تھی کہ ایک بار خواب میں نانی ماں آئی تھیں اور ان کا لنگڑا پیر ٹھیک ہو گیا تھا، دیکھ اب تو میرا زخم بھی نہیں دکھ رہا ہے۔

یاشار کی ماں کو رونا آ گیا: خوشی اور جذبے سے رو رہی تھی اپنے بیٹے کو گود لیا

بھینچ لیا اور اس کا سر اور چہرہ چومتی ہوئی بولی: تو واقعی ٹھیک ہوگیا ہے؟ وہ لوگ تجھ سے خوش ہوگئے ہیں۔ اگر تیرا بابا جان لے ۔ ۔ ۔ ۔ تو نے بتایا تیرا انگوٹھا اب درد نہیں کر رہا ہے۔

یاشار نے بتایا: بالکل دوسری انگلیوں کی طرح ہوگیا۔ میں کل سے دوبارہ کام شروع کر سکتا ہوں۔

اس وقت اس نے اپنا زخم کھولا اور پتوں اور لگائے گئے مرہم کو اٹھایا اور زخم اپنی ماں کو دکھایا۔ زخم کی جگہ سفید ہو چلی تھی اور کوئی سوجن اور گندگی باقی نہ تھی۔ زخم کو دوبارہ باندھا۔ یاشار کھڑا ہوگیا۔ اپنے لحاف توشک اور تکیہ کو تہ کیا اور چارپائی کو کنارے رکھا اور بولا: یہاں موسم اب گرم ہوگیا ہے۔ آج کی رات میں چھت پر سوؤں گا۔

اس کی ماں اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ کچھ نہ بولی۔ یاشار صحن کی طرف گیا کہ منہ ہاتھ دھوئے۔ کلثوم کمرہ میں دعا پڑھنے جا رہی تھی اور شکرانہ ادا کرنے جا رہی تھی۔ یاشار کو اچانک یاد آیا کہ وہ صمد کے پروں کو جنگل میں چھوڑ آیا ہے۔

## ● چوتھی سوار:

یاشار نال پر بیٹھ کر پیشاب کر رہا تھا کہ اس کی ماں کی نگاہ دیوار کے پاس پڑے ہوئے گائے کے پیر پر پڑی۔ ایک کالی بلی بھی دیوار پر بیٹھی ہوئی سونگھ رہی تھی۔ یاشار نے گائے کے پیر سے کوئی چیز نہ سمجھی پھر اسے یاد آگیا کہ گزشتہ رات اولدوز اور گردیا نے اس سے کیا کہا تھا۔

پچھلی رات جب وہ سب جنگل سے لوٹ رہے تھے، اولدوز نے اس سے کہا تھا جب کل صبح تمہاری ماں ہمارے گھر آئیں تو میں گائے کا پیر تمہارے پاس بھیج دوں گی۔ اس کا خیال اچھی طرح سے رکھنا۔

یاشار نے پوچھا تھا: کس لیے؟

گردیا نے جواب دیا تھا: یہ آخر عام گایوں کی طرح نہیں تھی ہم اس کا پیر حفاظت سے رکھیں گے۔ ہمارے کام آئے گا۔ جب کبھی ہم پر کوئی مصیبت

پڑے گی تو ہم اس سے مدد مانگ سکیں گے۔

یاشار انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اولدوز کے چلانے اور فریاد کی آواز سنائی دی۔ اس کی چیخ اور پکار کے بیچ سنا جا سکتا تھا کہ وہ کہہ رہی تھی۔

ست مارو اماں!۔۔ میری غلطی تھی، پھر ی خالہ مجھے بچاؤ۔۔۔۔ آہ لوگو۔۔۔

یاشار نادوان کے پاس جکڑا ہوا حواس باختہ کھڑا ہوا تھا اور سمجھتا نہیں تھا کہ کیا کرے۔ اچانک کمانے کے پیر کے پاس دوڑ کر گیا، اسے اٹھایا اور چپکے سے بولا: سوتیلی ماں اولدوز کو مار ڈالنا چاہتی ہے۔ اس وقت ہم کیا کریں!

ایک کمزور آواز یاشار کے کانوں میں سنائی دی۔ مجھے چھت پر پھینک دو اور کالی بلی سے خبردار رہنا۔

یاشار نے کالی بلی کو مار کر گھر سے بھگا دیا پھر پیر کو چھت پر پھینکا۔ پیر کے گرنے کی آواز سن کر اس کی اماں کمرے میں سے بولی۔ یاشار چھت پر کیا چیز گری ہے؟

یاشار نے کہا: کوئی چیز نہیں، کوے کا پیر جو تم میرے لیے لائی تھیں، میں نے چھت پر ڈال دیا کہ سوکھ جائے۔

اس کی ماں بولی: اولدوز نے دیا تھا۔ تجھے کچھ معلوم ہے کس لیے کوے کا پیر تجھے چاہیے؟

یاشار نے جواب دیا: معلوم ہوتا ہے پھر سوتیلی ماں اولدوز کو مار رہی ہے۔

اماں بولی: ہم سے کوئی مطلب نہیں عزیز بیٹے۔ ہر کوئی اپنا معاملہ خود اچھی طرح جانتا ہے۔

یاشار بولا: آخر ماں۔۔۔

اس کی اماں نے کہا: اچھا ہاتھ پاؤں جلد دھو لے، آ ہم دن کا کھانا کھائیں۔

یاشار نے اب دیر نہ کی۔ سیڑھی کے زینے پر چڑھا ہوا چھت کے اوپر گیا۔ کوے کے پیر نے بتایا: میں نے دس بیس چھوٹی سواروں کو بھیجا ہے کہ وہ سوتیلی ماں کی خبر لیں۔ ذرا کالی بلی کا خیال رکھنا۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی روز مجھے منہ میں دبائے گی اور لے کر جائے گی۔

ایثار نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی دیکھا کہ کالی بلی دبے پنجوں کے بل آگے چلی آرہی ہے۔ ایک ڈھیلا اس کے ہاتھ کے پاس ہی تھا اسے اٹھایا اور چلایا۔ کالی بلی تن کر کھڑی ہوئی اور پھر بھاگ نکلی۔

## • مرچ کتنی مزیدار ہے

## • چیونٹی سوار اولروز کی مدد کرتے ہیں

اب ہم اس لیے پھر لوٹ کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں کہ اولروز کے ساتھ کیا ہوا اور اس کے بابا اور ماں کیسے ہیں؟

اولروز کے بابا کے گھر میں دو کمرے قبلہ کی طرف ایک بیچ کے دالان سے جڑے ہوئے بنے تھے۔ ایک سونے کا جس میں توشہ خانہ بھی تھا اور دوسرا مہمانوں اور ان لوگوں کے لیے استقبالیہ کمرہ تھا۔ دہلیز کے ایک طرف چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا۔ صحن کے دوسری طرف پاخانہ اور ایک تنور تھا جس کا دودکش چھت کے اوپر تک چلا گیا تھا۔ استقبالیہ کمرے سے ملا ہوا ایک زینہ چھت سے جا ملتا تھا۔

اس دن جس وقت ایثار کی نانی ان کے گھر گئی، سوتیلی ماں باورچی خانہ میں بیٹھی ہوئی خاگینہ بنا رہی تھی۔ پری کو کمرہ کے باہر بٹھا دیا تھا کہ اولروز کے کالے کتے کو ڈنڈے مارے اور اس کی اچھی طرح خبر لے۔ ماں نے صبح ہی سے اندازہ لگا لیا تھا اور شاید جان لیا تھا کہ اولروز اور اس کی گڑیا کے بیچ کچھ راز ضرور ہے۔

پری چپ چاپ دروازہ کے پیچھے کان لگا کر کھڑی ہوئی تھی اور سوراخ سے اولروز کی حرکتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ بابا ابھی تک اپنے دفتر سے نہیں لوٹا تھا۔

اولروز نے ابھی تک گڑیا سے بات کرنے کا موقع نہیں پایا تھا۔ ماں اور بابا نے بہت کوشش کی تھی کہ اس سے کچھ اگلوا لیں لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ اولروز نے اپنے آپ کو بے تعصب بنا کر رکھا تھا۔ جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ کوئی اسے نہیں

دیکھنا ہے تو گڑیا کے پاس پہنچ کر بولی: سوتیلی ماں ہر وقت پیچھے پڑی رہتی ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان گئی ہے۔

بولتی گڑیا نے کہا: اچھا ہے کچھ دنوں تک ہم ایک دوسرے سے دور رہیں۔ اولدوز بولی: میری خالہ بڑی نہیں ہیں لیکن پتا ہے سوتیلی ماں کے ہاتھوں سے اگر جان لے گی کہ میرے پاس بولتی گڑیا ہے تو ایک گھڑی بھی صبر نہیں کر سکتی ہے، تنور میں آگ جلائے گی اور تجھے آگ میں ڈال دے گی جلا کر راکھ کر دے گی۔

بات کے دوران پری چغلی کر سوتیلی ماں کو خبر کر آئی۔ ماں دھول اڑاتی دروازہ پر آگئی۔ کوئی آواز نہیں آئی۔ سوراخ میں سے اولدوز کو دیکھا کہ توشہ خانہ کا دروازہ بند کیا اور دیوار کے پاس بیٹھ کر اپنی انگلیوں پر گنتیاں گنتی اور کھیلنا شروع کر دیا۔ ماں نے دروازہ کھولا اور پوچھا: کس سے باتیں کر رہی تھی؟ . . . جلدی بتا ورنہ تیرے ہاتھ سوئیوں سے چھید ڈالوں گی۔ بے حیا لونڈیا . . .

اولدوز کا دل اس کے سینہ میں بیٹھ گیا چاہا کہ کچھ کہے۔ اس کی زبان کٹ سی گئی اور ہیں ہیں کرنے لگی۔ سوتیلی ماں نے اپنی قمیص سے سوئی نکالی اور اولدوز کے ہاتھوں میں گڑو دی۔ اولدوز چلا کر رونے لگی، ماں نے پھر سوئی گھسا دی۔ اولدوز نے ہاتھ پیر مارے اور چاہا کہ باہر نکل جائے مگر پری نے اسے پکڑ لیا اور ماں کے چہرے کے سامنے پکڑے رکھا۔ ماں نے اس کے دوسرے ہاتھ میں بھی سوئی گڑو دی اور بولی: اب تو اور جھوٹ نہیں بول سکتی ہے۔ میں تیری بابا نہیں ہوں کہ بہکاوے دیکھوں وہ بکری گڑیا کیا حیثیت رکھتی ہے؟ بتاتی ہے یا تیرے منہ میں مرچیں ڈالوں؟

اولدوز روتے ہوئے بولی: خالہ میں کچھ نہیں جانتی . . . . آخر مجھے کیا معلوم
ماں نے پری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: پری جا، مرچوں کا مرتبان اٹھا لا۔ مرچیں اسے اچھی طرح بولوا سکتی ہیں۔

پری دوڑتی ہوئی گئی اور مرچ کا برتن اٹھا لائی۔ سوتیلی ماں نے تھوڑا سا پسا ہوا مرچ اپنی ہتھیلی پر رکھا اور چاہا کہ اولدوز کو پکڑے کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار کے کونے میں چھپ گئی۔ ماں نے پری سے کہا: آؤ اس کا ہاتھ پکڑو

میں آ گیا ہے، سمجھا دوں کہ سوتیلی ماں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

پری اور سوتیلی ماں نے اولدوز کو چت لٹا دیا۔ ماں اس کے پیروں پر بیٹھ گئی اور پری اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر بیٹھی رہی۔ ماں نے اولدوز کا منہ کھولا اور چاہا کہ مرچ اندر ڈال دے کہ اولدوز کی چیخیں بلند ہوئیں۔ اس کی چیخ اتنی دردناک تھی کہ آواز دوسری طرف کے گھروں تک پہنچ رہی تھی، اولدوز چلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میں نے غلطی کی۔ . . . میری خالہ میری مدد کرو۔

پری نے کچھ نہ کہا، سوتیلی ماں بولی: جب تک سچ بات نہیں بتائے گی میرے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچ کر جا سکے گی۔

اولدوز نے روتے ہوئے کہا: میں تو کوئی بات نہیں جانتی۔ . . . مجھے چھوڑ دو۔ . . آہ لوگو!

اور کوشش کی کہ خود کو چھڑا لے۔ سوتیلی ماں نے مرچ اس کے منہ میں ڈال دی اور بولی: اب مرچ کھا اور دیکھ کہ کتنی مزیدار ہے۔

اولدوز کو کھانسی آ گئی اور ماں کے چہرے پر تھوک دیا۔ مرچ اس کی آنکھوں میں پڑ گئی۔ اچانک پری نے چیخ ماری اور اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ ہاتھ اپنی گردن پر لے گئی، ایک چیونٹا پوری طاقت سے اس کی گردن پر گوشت میں اپنا ڈنک گڑا دئے ہوئے تھا۔ پھر دوسرے چیونٹے نے سوتیلی ماں کی پنڈلیوں میں کاٹ کھایا۔ پھر تیسرے نے پری کے بازو میں کاٹا، پھر چوتھے نے سوتیلی ماں کی پشت کو کاٹ کھایا۔ پھر ایسا ہوا کہ دونوں صحن میں دوڑ کر بھاگ آئیں۔ آخر چیونٹوں کو جوتی کے تلے سے مارا اور جھٹکا را پایا لیکن ان کی کاٹی ہوئی جگہ اس طرح جل رہی تھی کہ ہر ایک کے تو آنسو نکل آئے۔ اولدوز کمرے کے بیچ اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پکڑے ہوئے تھی اور زار زار رو رہی تھی

کھانا جل جانے کی بو باورچی خانے سے آ رہی تھی۔

## • سوتیلی ماں اور پری کے بہانے

سورج ڈوبتے وقت یاشار نے اپنا مونڈھا چھت پر ڈال رکھا تھا اور اکر

چھت کے کنارے پیر لٹکا کر بیٹھے بیٹھے میں سورج کو دیکھ رہا تھا۔ سورج ڈوبتے وقت آسمان سے کنارے رنگ برنگی دھوپ کا بدلنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ فضا جلد جلد اودا بدلا کرتی تھی اور پھر ستارے چمک رہے تھے۔ اُن کا دُکھ اور پھیکے ، جو دھیرے دھیرے روشن ہوتے جا رہے تھے چمک رہے تھے اور جھپک رہے تھے۔

پری کی آواز نے اسے اپنی جگہ چونکا دیا۔ پری کمرے کی کے سامنے کھڑی تھی اور اس کی ماں سے کہہ رہی تھی۔ کلثوم اٹھو اور ہمارے گھر آؤ۔ تمہارے شوہر کا خط آیا ہے۔

چند منٹ بعد پاشا اور اس کی ماں اور لڑکے کے باپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور آنکھیں اس کے منہ کی طرف لگائے ہوئے تھے۔ پری اور ماں بھی کمرے میں تھے لیکن بولتی نہیں تھی۔

پاشا کا باپ خطوط باپ کے پتہ پر بھیجتا تھا۔ خط میں لکھا تھا کہ وہ بیمار ہے اور کام نہیں کر سکتا ہے ، انھیں چند دنوں میں اپنی بیوی اور بچے کے پاس لوٹ آئے گا۔

خط پڑھنا ختم ہونے جا رہا تھا کہ کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی ، چند مہمان آگئے سوتیلی ماں کے بھائی اور بھابی تھے اور ان کا چھوٹا بچہ بہرام بھی۔ بڑی دور سے آئے تھے۔ دوسرے شہر سے وہ بیٹھے اور محفل پوری ہونے لگی۔ سوتیلی ماں نے کلثوم سے رات کا کھانا بنانے کے لیے کہا۔

پاشا کبھی اپنی ماں کے پاس باورچی خانہ میں جاتا تھا اور کبھی آکر کمرے کے پاس بیٹھ جاتا تھا لیکن کچھ نہیں پاتا تھا۔ کہنا بہت چاہتا تھا لیکن کہنے کے قابل نہ تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس سے کوئی مطلب نہ رکھیں اور اسے لڑکے کے پاس جانے کی اجازت دیں۔

باتوں اور ہنسی کے بیچ بھابی نے ماں سے کہا : ہم تمھیں اور پری کو لیے جاتے ہیں۔ صبح روانہ ہو جائیں گے۔

سوتیلی ماں نے پوچھا۔ پری کا منگیتر لوٹ آیا۔

بھابی بولی۔ ہاں بس کل ہی شادی ہوگی

اس وقت پری کی طرف دیکھ کر زور سے ہنسی۔

**• کیا کبھی ایسا ہوگا کہ کوئی جان سکے،**

**• کہ سوتیلی ماں نے اولدوز پر کیا ستم ڈھائے؟**

رات کا کھانا ختم کر کے سوتیلی ماں نے سفر کا سامان اکٹھا کرنا اور باندھنا شروع کر دیا۔ کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں باندھنے لگی۔ توشہ خانہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یاشار کی نظر اولدوز کی پیٹھ پر پڑی جو منہ کے بل سوئی ہوئی تھی اور اس کا منہ کپڑے سے بندھا ہوا تھا۔

یاشار کی ماں نے پوچھا: اس لڑکی کو کیا ہوا؟ رات کا کھانا بھی کچھ نہ کھایا۔

سوتیلی ماں بولی: بیمار ہے، اچھا ہے کوئی چیز نہ کھائے۔

کلثوم نے پوچھا: اسے کیا ہوا ہے؟

ماں بولی: منہ میں چھالے نکل آئے ہیں۔

کلثوم اور سوتیلی ماں توشہ خانہ میں بات کر رہے تھے۔ ماں کا بھائی توشہ خانہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی باتیں سنیں، دروازہ آدھا کھولا اور اولدوز کو دیکھ کر پھر بابا سے بولا: اچھا اس لڑکی کو اتنے دن تک رکھ چھوڑا ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا۔ . . .

بابا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ابھی تک ہمارے پاس ہی ہے۔

بھائی نے ایک نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی اور بیوی نے ایک نظر اپنے شوہر پر پھر کسی نے کچھ نہ کہا۔

**• اندھیرے سے کون ڈرتا ہے؟**

**• رات چھت پر کیسی لگتی ہے؟**

رات زیادہ ہو چکی تھی۔ کلثوم باورچی خانہ میں برتن دھو رہی تھی۔ دوسرے بات کرنے میں مشغول تھے کہ بہرام نے اپنی ماں سے کہا:

ماں مجھے پیشاب لگا ہے۔

اس کی ماں نے کہا: اب تم خود ہی چلے جاؤ، جان مادر۔

بہرام بولا: نہیں، میں ڈرتا ہوں۔

سوتیلی ماں نے یاشار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: جا بہرام کے ساتھ چلا جا۔

یاشار کو خود ہی پہلے سے پیشاب لگ رہا تھا لیکن ایک طرح کی کاہلی نے اسے وہیں چپکا رکھا تھا اور چل کر پیشاب کو نہیں جا سکتا تھا۔ دونوں اٹھ کر ہوئے باہر گئے۔ اسی طرح نالی دان کے پاس کھڑے ہو کر پیشاب کر رہے تھے کہ بہرام بولا: تو بھی مدرسہ جاتا ہے؟ میں چوتھی جماعت میں ہوں۔

یاشار نے کہا: ہاں میں بھی۔

پھر خاموشی ہو گئی۔ یاشار کسی طرح بول نہیں سکتا تھا۔ پھر بہرام بولا: میں اپنے کلاس کا مانیٹر ہوں۔ میرے پاپا نے کہا ہے کو میرے لیے ایک سائیکل خریدیں گے۔ تم کیا اور کس طرح؟

یاشار بولا: میں نہیں۔

جب ان لوگوں نے لوٹنا چاہا۔ بہرام کی آنکھ زینے پر پڑی۔ پوچھا: یہ زینہ کس لیے ہے؟

یاشار بولا: چھت پر جاتا ہے، چلتے ہو اوپر جائیں، دیکھو۔

بہرام بولا: میں اندھیرے سے ڈرتا ہوں، چلو اندر چلیں۔

یاشار بولا: میں پہلے اوپر جاتا ہوں۔ تم میرے پیچھے آؤ۔

بہرام شش و پنج میں پڑ گیا، بولا: تم کو اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا۔

یاشار نے کہا: نہیں، میں تو راتوں کو کھلے چھت پر سوتا ہوں اور ڈرتا بھی نہیں۔

بہرام بولا: رات چھت پر کیسی ہے!

یاشار نے کہا: اگر چھت پر آؤ تو خود دیکھ لو گے۔

یاشار نے کہا اور سیڑھیوں پر رکھتا ہوا تیزی سے اوپر چلا گیا۔ بہرام تھوڑا

کشمکش کا شکار ہو گیا اور پھر دھیرے دھیرے اوپر گیا۔ یاشار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چھت کے بیچ میں لے آیا۔ آسمان میں ایک بالشت بھر بھی جگہ خالی نہ تھی، تمام جگہ ستارے ہی ستارے تھے۔ لکھوکھا لکھوکھا تارے۔ یاشار بولا: دیکھتے ہو ایک تارا ان کے سر پر ٹوٹا کمان بنا اور نیچے آ گیا۔ ایک اور ستارہ دور کے علاقہ میں ٹوٹا۔ چند کتے رات کے سناٹے میں بھوں بھوں بھونکے اور دور چلے گئے۔ ایک پتنگا گلی کے نکڑ کی طرف جا رہا تھا۔ ایک الو تیزی سے ان کے سامنے سے اڑا اور پھر پروانہ کا شکار کرتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ ایک اور تارا گرا اور اپنی روشنی کا لمبا نشان اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا چلا گیا۔ دوسری طرف کے چند گھروں میں سے گوبر اور لید کی بو آ رہی تھی۔

یاشار نے "راہ مکہ" کی طرف انگلی دکھاتے ہوئے کہا: یہ جو ہمارے سر پر پھیلی ہوئی روشنی آسمان کے اندر ہے، دیکھ رہے ہو۔

بہرام نے کہا: ہاں!

یاشار نے کہا: اسے ہمارے یعنی مکہ کا راستہ کہتے ہیں۔

بہرام بولا: کیا حاجی لوگ اسی راستے سے مکے جاتے ہیں؟

یاشار ہنسا اور بولا: نہیں بابا۔ جاہل لوگ اسے راہ مکہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ چھوٹے اور بے شمار ستارے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ تم خیال نہیں کرتے کہ جیسے بالکل جڑے ہوئے ہیں لیکن بہت فاصلہ پر ہیں۔ دور سے اسی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

بہرام بولا: پس کیوں لوگ اسے راہ مکہ کہتے ہیں؟

یاشار نے کہا: اور بھی معلوم ہے کچھ پرانے لوگ جو علم سے باخبر نہیں تھے ہر اس چیز کو جسے نہیں جانتے تھے افسانہ بنا دیتے تھے، یہ بھی انہیں افسانوں میں سے ایک ہے۔

بہرام نے ٹوکتے ہوئے کہا: ان باتوں کو تم اپنی طرف سے نہیں گھڑ رہے ہو!

یاشار بولا: میں نے یہ اپنے استاد سے سیکھا ہے۔ کیا تمہارے استاد تمہیں

یہ باتیں نہیں بتاتے ؟

بہرام بولا: نہ ہم تو صرف اپنا سبق پڑھتے ہیں۔

یاشار نے پوچھا: مگر کیا یہ باتیں سبق نہیں ہیں؟

ایک چمکیلا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں اونچا اٹھ گیا تھا اور تیزی سے سامنے چلا آرہا تھا۔ بہرام بجائے اس کے کہ یاشار کی باتوں کا جواب دے، بولا اس ستارے کو دیکھو کہاں جانا چاہتا ہے؟

یاشار بولا: وہ تارا نہیں ہے، مصنوعی چاند ہے، زمین سے آسمان پہنچایا گیا ہے۔

بہرام نے پوچھا: کہاں جا رہا ہے؟

یاشار بولا: اسی طرح زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔

بہرام بولا: تم مجھے بہکا رہے ہو، خود ہی یہ باتیں گڑھ رہے ہو۔

یاشار نے کہا: میں یہ باتیں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہمارے استاد نے ہم کو بتایا۔ تم بھی اپنے ماسٹر صاحب سے یہ باتیں پوچھ سکتے ہو۔

بہرام بولا: ہمارے معلم اس طرح کی باتیں نہیں بتاتے۔

یاشار بولا: بے شبہ جانتے نہیں کہ بتائیں۔

بہرام نے کہا: نہ ہمارے استاد ہر چیز جانتے ہیں۔ وہ بتلاتے ہیں، تم غلط کہتے ہو۔

گرما گرم بحث ہو رہی تھی کہ سوتیلی ماں کی آواز صحن میں سنائی دی، بہرام کہاں ہو؟

بچے اپنی جگہ اچھل پڑے۔ بہرام پھر اندھیری رات کے ڈر سے رونا ہی چاہتا تھا کہ یاشار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولا: ڈرو نہیں لڑکے، میں تمہارے بغل میں کھڑا ہوں۔

سوتیلی ماں نے یاشار کی آواز سنی اور غرائی۔ بھیڑیے، بچہ کو چھت پر کس نے لے لیا؟

ماں نے دیر نہیں کی اور تیزی سے چھت پر گئی۔ بہرام کو یاشار سے چھڑا

لیا اور بولی: جا بھاگ جا! . . . ۔ الٹ تخریر ا ۔

یاشار نے کہا: رنڈی!

سوتیلی ماں بھڑک اٹھی اور یاشار کے گال پر زوردار تھپڑ مارا اور یاشار کا ہاتھ جھٹکا بہرام کا ہاتھ پکڑا اور نیچے آگئی۔ یاشار تھوڑی دیر کھڑا رہا آخر اس کا غصہ کم ہوا اور رونا شروع کر دیا۔ اپنی چھت پر چلا آیا اور چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔

## ● آخر کار کالی بلی نے اپنا کام کر ہی دیا

یاشار صبح صبح مسافروں کی کھٹ پٹ سن کر جاگ گیا۔ دھوپ چھت پر پھیل گئی تھی اور پیاری اور میٹھی لگ رہی تھی۔ اس کی ماں نے سوتیلی ماں کا جھولا اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور پھر تمام لوگوں کے بعد گھر سے باہر نکل گئی تھی۔ دونوں گھر خالی تھے۔ یاشار نے ایک جمائی لی اور چل کر زینے کے ذریعہ اولدوز کے گھر گیا۔ اولدوز نے اپنے منہ پر بندھا کپڑا کھول دیا تھا اور توشہ خانہ کے ادھر ادھر گھومے ہی جا رہی تھی کہ یاشار نے اسے پکارا۔ کیا کھوج رہی ہو؟ اولدوز!

اولدوز نے سر اٹھاتے ہوئے کہا: تم ہو یاشار؟

یاشار بولا: ہاں! تمہاری گڑیا کا کیا حشر ہوا؟

اولدوز بولی: مجھے نہیں معلوم۔ اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔

اولدوز نے گزشتہ دن کے واقعات کو چند جملوں میں یاشار کو بتایا۔ یاشار نے بھی کباب کے سیخ اور جوتوں کا حال کہہ سنایا۔ اس وقت دونوں نے سارے سوراخ اور بل تلاش کیے لیکن کچھ پتہ نہ تھا۔ یاشار بولا۔ ہو سکتا ہے سوتیلی ماں اپنے ساتھ لے گئی ہو۔

اولدوز بولی: ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

یاشار نے کہا: چوہے اسے تلاش کر سکتے ہیں۔ اگر زمین میں بھی ہوگی تو وہ کھود کر اس کا پتہ لگا لیں گے۔

اولدوز بولی: بس جاؤ اور گلاٹے کا پیرا اٹھا کر لے آؤ۔

یاشار تیزی سے چلا گیا ۔ چھت پر کالی بلی کو دیکھا کر ایک چیز منہ میں دبائے تیزی سے بھاگی جا رہی ہے ۔ یاشار نیچے آیا اور کتے کی کوٹھری کی تلاش میں گیا جو صحن کے ایک کونے میں تھی اور وہاں کالے کا بیر چھپا رکھا تھا ۔ کوٹھڑی خالی تھی تیزی سے چھت پر آیا لیکن کالی بلی کا کوئی پتہ نہ تھا ۔ پھر نیچے آیا اور پھر چھت پر گیا ۔ اس طرح بے کار دوڑ دھوپ کر رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے ۔ آخر کار اپنی ماں کی آواز سن کر چونکا ۔ اس کی اماں نالی پر اولدوز کا منھ ہاتھ دھو رہی تھی ۔ یاشار بھی ان کے پاس چلا گیا ۔ اس کی اماں بولی : یاشار! اگر تیرے سر پر بڑ کورسے ہوں تو اچھا ہے اپنے کام پر چلا جا ۔

یاشار نے کہا : اماں ، تم کپڑے دھونے نہیں جا رہی ہو ؟

کلثوم بولی : اولدوز کے بابا نے کہا ہے کہ میں گھر میں رہوں اور اولدوز کی دیکھ بھال کروں ، میں اس کے لیے دن کا کھانا بھی پکاؤں گی ۔

یاشار نے پوچھا : آج دادا آ رہے ہیں ؟

اس کی اماں بولی : اگر آئے تو تجھے خبر کر دوں گی ۔

## • اولدوز کے برابر گڑیا

## • قالین بنانے والے بچوں کا شور

دو تین دن بعد یاشار کا بابا آگیا ۔ ایسا بیمار تھا کہ صبح سے شام تک سوتا تھا اور کراہتا تھا ۔ کلثوم اور یاشار ڈاکٹر کو بلا کر لائے ۔ دوا خرید لی ۔ یاشار کی ماں اب کام پر نہیں جا سکتی تھی ۔ گھر میں رہتی تھی اور اپنے شوہر اور اولدوز کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی اور کبھی منھ دھونے کا دامن بھی بنا لی تھی جو پڑوسی عورتیں خرید لی تھیں یا خود لے جا کر حمام کے پاس فروخت کر لی تھی ۔

یاشار قالین بننے کا کام کیا کرتا تھا ۔ گھر کے خرچ کا زیادہ بوجھ اسی پر تھا ۔ اور بے کاری کے اوقات بھی اولدوز کے پاس گزارتا تھا ۔ کچھ دنوں تک بولتی گڑیا کے گم ہو جانے کا رنج دونوں کو رہا اور بے کار تلاش میں سرگرداں رہے ۔ آخر کار

طے کیا کہ دوسری گڑیا بنائیں اور جلد ہی اس کی تیاری بھی شروع کر دی ۔

اولدروز نے تاگا سوئی ناپنا اور کاٹنا اور سینا یاشار کی اماں سے سیکھا تھا۔ وہاں سے کپڑوں کے قسم قسم کے ٹکڑے ڈھونڈ لائے اور کام میں لگ گئے ۔ یاشار نے اپنے کارخانہ سے ریشم کی لچھوں کترنیں لایا تاکہ گڑیا کے ہاتھوں اور پیروں کے نیچے رکھ دیا ۔ چاہتے تھے کہ گڑیا اولدروز کے قد کے برابر ہو ۔ یہ طے کیا کہ اس کے چہرہ پر یاشار نقاشی کرے گا ۔ گڑیا کے تمام اعضا کو ایک ایک کر کے بنا رہے تھے اور الگ رکھتے تھے کہ پھر ایک دوسرے سے ملا کر سل لیں گے ۔ اس کا سر بنانے کے لیے پلاسٹک کے ایک پرانے فٹبال سے مدد لی۔ فٹبال کو سفید کپڑا منڈھا اور یاشار ایک روز جمعہ کے دن نماز پڑھ کر ظہر کے وقت تک تار بیٹھا رہا اور اس کی آنکھوں اور منھ پر نقاشی کرتا رہا ۔

بیس روز بعد گڑیا پیروں پر کھڑی ہو گئی ۔ اولدروز کے قد کے برابر ایکی ہونٹ اور ٹھوڑی نکلے ہوئے جھکی ہوئی ہنستی سی دکھتی ۔ خوش نہ تھی ۔ بچے بیٹھ کر سوچنے لگے کہ آخر ان کی گڑیا کیسی ہے ؟ کیوں بھنویں تنی ہیں اور مسکرا نہیں رہی ہے ۔ آخر کار سمجھ گئے کہ ان کی گڑیا کو لباس چاہیے ۔

اتنی بڑی گڑیا کے کپڑے سینا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ زیادہ کپڑوں کی ضرورت تھی ۔ نئے لباس کا کاٹنا اور فٹ کرنا بھی ایک اور مشکل کام تھا ۔ دو تین دن اسی طرح گزر گئے اور بچوں کی عقل میں کوئی بات نہ آ سکی

یاشار ہفتہ کے روز اپنی مزدوری لاتا تھا اور اپنی ماں کو دے دیتا تھا اور اس میں سے روزانہ دس پیسے لے لیتا تھا ۔ ایک دن اولدروز سے بولا : میں اپنے پیسے جمع کر رہا ہوں اور گڑیا بی بی کے لیے لباس خریدوں گا ۔

لیکن جب حساب کیا تو معلوم ہوا کہ ان پیسوں سے تو مہینوں بعد بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ پھر کچھ روز یونہی بیت گئے ۔ بڑی گڑیا اسی طرح جھکی ہوئی ننگی پیروں پر کھڑی ہوئی تھی ۔ بچے اس سے کتنا ہی بات کرنا چاہتے تھے مگر کوئی جواب نہیں ملتا تھا

یاشار اسی طرح جب ایک روز اپنی قالین بافی کی کھڈی پر بیٹھا ہوا تھا اور تانا بانا جوڑ رہا تھا کہ ایک خیال اس کے ذہن میں آیا ۔ اس نے سوچا کہ گڑیا تو اولدروز

کے قد کے برابر ہے اور اس لیے اولدروز کے کپڑے گرہ یا کے جسم پر آسکتے ہیں۔ اس خیال سے اتنا خوش ہوا کہ گانا شروع کر دیا۔ قالین بننے والوں کے گیتوں میں سے ایک گنگنا رہا تھا پھر تانے کو زمین پر رکھا اور چھری اٹھالی۔ چھری کی آواز کے ساتھ گاتا جاتا تھا اور خوش بھی ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد دوسرے بچے بھی ایک کی آواز میں اپنی آواز ملا بیٹھے اور کارخانے کی دھول میں اٹی اندھیری دنیا قالین باف بچوں کی آواز سے پر ہو گئی۔

میں بھی کر شکر خریدوں
اپنی پیالی میں ڈالوں
میری جیب میں دس پیسے بھی نہ تھے
پھر میں نے بہانے اور شی شاکرنے کا ارادہ کیا

•

دکاندار نے ایک باٹ ہاتھوں میں اٹھایا
اور مار کر میرا سر پھوڑ دیا
میرے سر کا خون بند نہیں ہو رہا تھا
پھر میں نے اپنے بھائی کو آواز دی۔

## • سوتیلی ماں کی واپسی

عصر کے وقت جب پاشار لوٹا، اس کی اماں نے بتایا کہ بابا اور ماماں لوٹ آئے۔ پارشا کا چہرہ مرجھا گیا اور اس لیے کہ اس کی اماں کچھ نہ جانتے دوڑ کر گلی میں گیا، اس رات کو اولدروز سے نہ مل سکا۔ رات میں چھت پر سویا۔ اس کی اماں بابا کے کمرے میں سوئی تھی کیونکہ بابا بیمار تھا۔ آدھی رات کو پاشار جاگا، دیکھا کہ اس کے ہمسایہ کے صحن کے بیچ نالی کے پاس کوئی چیز جل رہی ہے اور دھواں اٹھ رہا ہے۔ سوتیلی ماں بھی تیل کا کنستر ہاتھ میں لیے آگ کے پاس کھڑی ہوئی ہے۔ پاشار تھوڑی دیر تک حیران و پریشان دیکھ رہا تھا پھر سو گیا۔ صبح کو بھی اٹھا اور اپنے کام پر چلا گیا۔

- آہ، بڑی گڑیا
- کیوں تجھے آگ میں جلا دیا اور کچھ بھی نہ کہا کہ بچوں نے
- تجھے ہزار آرزوؤں سے بنایا تھا

اب ہم تھوڑا پیچھے واپس آئیں اور دیکھیں کہ جب سوتیلی ماں لوٹ کر آئی تو اولدوز اور بڑی گڑیا پر کیا بیتی؟

اولدوز ہمیشہ جس وقت اپنی گڑیا سے کوئی کام نہ رکھتی تھی تو اسے توشہ خانہ میں لے جا کر چارپائیوں اور تختوں کے پیچھے چھپا دیا کرتی تھی۔ اس لیے جس وقت سوتیلی ماں اچانک واپس آئی تو کوئی چیز نہیں پائی صرف دیکھا کہ اولدوز ناودان کے پاس بیٹھی اپنی انگلیوں پر کچھ گن رہی ہے اور کلثوم بھی آنگن میں جھاڑو دے رہی ہے۔ بابا کمرے میں اپنا چینٹ استری کر رہا تھا۔ سوتیلی ماں کا بھائی اسی شام لوٹ گیا لیکن جانے سے پہلے بابا سے تھوڑی بات چیت کی۔ اولدوز نے تھوڑا بہت سمجھ لیا کہ گفتگو اسی کے بارے میں ہے۔ گویا سوتیلی ماں نے اپنے بھائی اور باپ سے اولدوز کے ہاتھوں اٹھائی ہوئی تکلیفوں کی شکایت کی تھی۔

رات سوتے وقت بڑا واقعہ پیش آیا۔ سوتیلی ماں جب اپنی چارپائی اٹھا رہی تھی تو دیکھا کہ کوئی سوتی سی چیز اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ جلد ہی فریاد کرنا اور چیخنا شروع کر دیا اور معلوم ہوا کہ وہ سوتی اور بڑی چیز اولدوز کی گڑیا ہے۔ وہ گڑیا جو اس نے خود ہی بنائی ہے۔

ماں نے بڑی گڑیا کو کھڑکی سے باہر نالی میں پھینکا اور اولدوز کو آواز دی:

جا مردہ سنبھالے والے کے گھر جا! یہی گڑیا بنائی تھی!... مجھے ڈرا دیا۔ میں تجھے بتاتی ہوں کہ تو میرے ساتھ کتنی بے حیائی کر رہی ہے۔ میں نے ابھی تو تیری ایک گڑیا سے چھٹکارا پایا ہے۔ تو چاہتی ہے کہ پھر ہمارے گھر میں جنوں کو بلائے۔ ہاں!

بابا حیران و پریشان کھڑا تھا سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی جسامت کی گڑیا کہاں سے آ گئی۔ اسے بالکل یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اولدوز نے اسے بنایا ہوگا۔ کیا بیٹی یہ

تم نے کب بتائی مجھے پتہ نہ چلا؟

اولدوز کا منہ بولنے کے لیے کھلا ہی تھا۔ سوتیلی ماں بولی جاؤ دعا کرو کہ میں اس شکل میں آپ کو غصہ دلانا نہیں چاہتی ورنہ تجھے وہ تھپڑ مارتی کہ تو خود اس گھر سے نکل بھاگتی۔

بابا اپنی بیوی سے بولا: ہاں، تمہیں اپنا خون گاڑھا نہیں کرنا چاہیے۔ تیرے بچے کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

سوتیلی ماں نے اپنے شوہر کو بتاتے ہوئے کہا: میں اسی بات پر تجھے گھر میں رکھے ہوئے ہوں: میرے باپ اور بھائی نے تیری لونڈی بنا کر مجھے اس گھر میں نہیں بھیجا۔

بابا بولا: میں جب بھی رو نیکیت۔ جیسی کا بھی ہوگئی ہے، نہیں بکتی ہے۔

سوتیلی ماں بولی: جیسا بھی چاہتی ہے ہو۔ جب میں یہ چیز نہیں برداشت کر سکتی تو پھر یہ کیوں گڑیا بنا کر مجھے پریشان کرتی ہے؟

اچانک اولدوز رونے لگی اور ایک ایک کر روتی ہوئی زور زور سے بولی:

میں... اپنی بولتی گڑیا... کو... کو... چا... چاہتی ہوں...

جیسے ہی سوتیلی ماں نے گڑیا کا نام سنا اور غصہ ہو گئی اور اولدوز کا بال ہاتھ میں پکڑ کر گھسیٹنے لگی۔ آئندہ کبھی اس گندگی کا نام لینے کا حق تجھ کو نہیں ہے۔ ابھی میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ میرے پیٹ میں کوئی شے بن جائے۔ اس قسم کی چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں اور یہ جن ہمارے گھروں میں اپنے پیر جمائیں گے۔ تو نے سمجھا یا پھر تیرے سر پر مٹی اور تنکے بچھاؤں؟

پھر اولدوز نے اپنے آپ کو سوتیلی ماں کے چنگل سے چھڑا لیا اور بھاگ کر دالان کی طرف جانا چاہا کہ اپنی بڑی گڑیا اٹھا لے جو کہ اوندھے منہ نالی پر پڑی ہوئی تھی، لیکن سوتیلی ماں نے اسے چوکھٹ سے باہر جانے کا موقع ہی نہ دیا۔

چند منٹ بعد اولدوز توشہ خانہ میں بھری ہی ایک کونے میں تھی اور دروازہ بند کر دیا تھا۔ ماں تیل کا پیالہ ہاتھ میں لیے نالی کے پاس بڑی گڑیا کو جلانے اور دھواں نکلنے کا تماشا کر رہی تھی۔ بابا ابھی تک سوچ میں تھا کہ معلوم کرے کہ اتنی بڑی گڑیا کہاں سے اس گھر میں آ گئی تھی۔

## • تنہائی اور غصہ میں
## • چلّے کی رات کا انتظار

دن پہ دن گزرے جا رہے تھے۔ یاشار کا بابا پوری گرمیوں بھر بیمار پڑا رہا اور روز کھانستا رہتا تھا۔ بچے ایک دوسرے سے بہت کم مل پاتے تھے اور دیکھنے میں گڑیا کا غم مناتے تھے اور خاص طور پر بولتی گڑیا کا۔ اولدوز کی مجال نہیں تھی کہ سوتیلی ماں کے سامنے گڑیا کا ذکر کرے۔ لیکن کیا یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بولتی گڑیا کے بارے میں نہ سوچے؟ کیا یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس عجیب رات کو بھول جائے؟ اس جنگل کی رات کو، اس پُراسرار جنگل کو؟ کیا ممکن تھا کہ چلّے کی رات کا خیال نہ کرے؟ چلّے کی شب دوبارہ جنگل میں تمام گڑیاں جمع ہو رہی تھیں۔ لیکن اب اولدوز اور یاشار کے پاس گڑیا نہیں تھی کہ انھیں جنگل لے جاتا۔

آہ۔ میری بولتی گڑیا!

تو نے اپنی تھوڑی سی عمر میں بچوں کے دل پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ وہ تمام عمر تجھے نہیں بھلا سکیں گے۔

دن، ہفتے اور مہینے گزر گئے۔ اولدوز چلّے کی رات کی امید میں منٹ منٹ گنتی رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس رات تک بولتی گڑیا کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو ان تک پہنچا لے گی۔ سوتیلی ماں کا پیٹ باہر نکل آیا تھا۔ اپنے ہونے والے بچے کی امید میں بڑا گھمنڈ کر رہی تھی اور اولدوز کو ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے ڈانٹتی تھی۔

## • بیکار کی امیدیں
## • تمام خوشیاں کیا ہوئیں؟

ایک روز بابا بجلی خرید کے آیا۔ گھر میں بجلی لگائی گئی۔ بابا نے ایک ریڈیو بھی خریدا۔ اس کے بعد گھر میں بجلی کا بلب جلنے لگا اور ریڈیو کی آواز گونجنے لگی۔

چلّے کی رات کی امید واری بیکار تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بولتی گڑیا ہمیشہ کے لیے گم ہو گئی تھی۔ اس کا گنگنانا، چہکنا اور میٹھی باتیں کرنا سب رخصت ہو گیا اور وہ ایک بے زبان اور گونگی گڑیا بن گئی۔

یاشار مدرسہ جاتا تھا مگر بچے ایک دوسرے کو بہت کم دیکھ پاتے تھے۔ خاص طور پہ اس لیے کہ سوتیلی ماں یاشار کو اپنے یہاں پھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ کہتی تھی: یہ بے شرم لڑکا لڑکی کے اخلاق کو خراب کر رہا ہے۔

## • ہماری کہانی ختم نہیں ہوتی ہے

## • اولدوز اور کوّے

بے شک تم منتظر ہوگے کہ آخر گڑیا اور بچوں کا کیا حشر ہوا؟ ..... اگر کوّوں کا جھگڑا بیچ میں نہ آتا تو شاید اولدوز کی بے سرگی ہوتی اور وہ ہاتھ سے نکل گئی ہوتی لیکن "بی کوئی" اور کوّوں کی بچوں سے دوستی نے کام کا رُخ بدل دیا۔ اولدوز اور یاشار پھر سے ایک نئی زندگی پا گئے اور آخر سخت کوشش کی کہ کوّوں کے شہر کا سفر کر سکے۔

جس طرح کہ تم نے پڑھا اور دیکھا کہ کوّوں کا قصہ خود ایک دوسری کہانی ہے، جو "اولدوز اور کوّوں" والی کتاب میں لکھی گئی ہے۔ بولتی گڑیا کی کہانی یہاں ختم ہوتی ہے۔

اس کتاب کے مصنف لکھتے ہیں: میں اولدوز کی بولتی گڑیا کے گم ہو جانے کے کئی سال بعد اولدوز سے واقف ہوا جیسا کہ خود اولدوز نے "اولدوز اور کوّوں" کی کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے۔ میں اولدوز کی والدہ کے گاؤں میں اس سے ملا۔ اس وقت اولدوز بارہ تیرہ سال کی تھی میں بھی اسی گاؤں میں استاد تھا۔ آخر میں اور دوسرے شاگرد اولدوز کی بولتی گڑیا کو پا سکے۔ یہ واقعات ایک الگ کہانی ہے جسے میں "کوّے، گڑیاں اور انسان" میں لکھوں گا۔ اب اس کہانی کے چھپنے کا انتظار کرو۔

تمام سمجھدار بچوں کا دوست،
اور اولدوز کے تمام دوستوں کا
اور یاشار، کوّوں اور بولتی گڑیا کا دوست
بہرام

# گنجا کبوتر باز

پرانے زمانے میں ایک گنجا اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔
ان کے گھر میں ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں شہتوت کے ایک درخت میں گنجے
کی کالی بکری بندھی رہتی تھی۔ جو گھاس کھایا کرتی، اپنی ڈاڑھی ہلاتی، زمین کو اپنے کھروں
سے کھودتی رہتی اور میں میں کیا کرتی تھی۔ ان کا کمرہ پچھم رخ تھا جس میں ایک
چھوٹی سی کھڑکی اور بیچ میں ایک تندور رہتا اور یہ ایک چبوترہ اور چھت میں
ایک سوراخ آسمان کی طرف بنا تھا تاکہ دھواں نکل سکے، ہوا اور روشنی
وغیرہ آ جا سکے۔ کھڑکی کو گھاس کے پتوں سے شیشے کی طرح ڈھانک رکھا تھا
دیواروں پر بھوسہ ملی مٹی پتی ہوئی تھی اور چاروں طرف طاق اور الماریاں تھیں
گنجا صبح صحرا چلا جاتا، چارا اور کانٹا کاٹتا، گٹھڑ بناتا اور گھر لاتا تھا۔ تھوڑا
بکری کو دیتا تھا اور بقیہ چھت پر ڈھیر بنا دیتا تاکہ جاڑوں میں بیچے یا پھر اپنی
بکری کو دے۔ دوپہر بعد کبوتر اڑاتا تھا۔ اچھا کبوتر باز تھا، دس پندرہ
کبوتر تھے۔ سیٹی بھی اچھی بجاتا تھا۔

بڑھیا صبح سے شام تک اپنے اون کاتنے کے چرخے کے پاس بیٹھی رہتی
اور اون کاتتی رہتی تھی۔ ماں اور بیٹا اس طرح اپنی زندگی گزار رہے تھے۔
بادشاہ کا محل ان کے جھونپڑے کے سامنے تھا۔ بہت خوبصورت محل تھا۔
عقل اسے دیکھ کر دنگ رہ جاتی تھی۔ بادشاہ کی لڑکی گنجے پر عاشق ہو گئی

تھی جب بھی گنجا اس کے محل کے سامنے چھت پر کبوتر اڑاتا تھا، لڑکی اپنی بالکنی
اور لونڈیوں کے ساتھ اوپر آتی اور کبوتر بازی کا تماشہ دیکھتی اور اس کی سیٹیاں
سنا کرتی۔ کبھی آنکھوں کے اشارے سے گنجے سے کچھ کہتی بھی تھی مگر گنجا کوئی توجہ
نہیں کرتا تھا۔ اس طرح رہتا کہ تم سمجھو کہ وہ لڑکی کو جانتا ہی نہیں۔ لیکن سچ تو
یہ کہ وہ بادشاہ کی بیٹی سے زیادہ لڑکی کا عاشق تھا لیکن نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی یہ بات جان
لے۔ جانتا تھا کہ بادشاہ کسی وقت اپنی بیٹی ایک گنجے لڑکے کو نہیں دے گا جو دنیا
میں صرف ایک بکری، پندرہ کبوتر اور ایک بوڑھی ماں کا مالک تھا۔ اور سا گر
بیاہ بھی دے تو بھی بادشاہ کی بیٹی، دھوئیں اور جھونپڑے میں بند ہو کر چلے گی۔
بادشاہ کی بیٹی ہر ترکیب کرتی لیکن گنجے سے کچھ نہ کہلوا سکی یہاں تک کہ ایک
روز ایک بھیڑ کا دل چھید چھید کر اس کی کھڑکی کے سامنے لٹکوایا لیکن گنجے نے پھر
بھی کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ کانٹوں کے ڈھیر کے ایک کنارے کبوتر اڑاتا رہا، سیٹی
بجاتا رہا اور اپنی اماں کے چرخے کی دریں دریں سنتا رہا۔

آخر بادشاہ کی بیٹی بیمار ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔ اب چھت پر نہیں آتی تھی
اور کھڑکی سے گنجے کو نہیں دیکھتی تھی۔

بادشاہ نے تمام حکیموں کو اپنی بیٹی کے سرہانے جمع کیا۔ کوئی بھی ان
میں سے اس کا علاج نہیں کر سکا۔

تمام قصہ کہنے والے اس قسم کی جگہوں پر کہتے ہیں کہ بادشاہ کی بیٹی نے اپنے
دل کا راز کسی پر نہیں کھولا، چاہے ڈر سے یا شرم و حیا سے۔ لیکن میں کہتا ہوں
کہ لڑکی نے اپنے دل کا راز باپ سے کہہ دیا جب بادشاہ نے سنا کہ اس کی لڑکی
گنجے لڑکے کی عاشق ہو گئی ہے تو سخت خفا ہوا اور چلایا، اگر ایک بار پھر اس
گندے کا نام تیری زبان پر آیا تو تجھے شہر سے باہر نکال دوں گا۔ مگر کیا ہو سکتا
کا تھا کہ اس گندے کی عاشق ہوئی۔ تیری شادی وزیر کے لڑکے سے
کر دوں گا۔ والسلام۔

لڑکی نے کچھ نہ کہا: بادشاہ گیا، تخت پر بیٹھا اور وزیر کو پاس بلایا اور
بولا: وزیر: آج ہی روز گنجے کا سر اڑا دو اور [illegible]

پڑ گئے۔

وزیر نے اپنے چند تندرست نوکر دو گنجے کے گھر بھیجا۔ گنجا تمام واقعے سے بے خبر کبوتروں کو دانہ دیتے ہی جا رہا تھا کہ وزیر کے آدمی گھر پر ٹوٹ پڑے اور پلک جھپکتے ہی کبوتروں کا سر اڑا بیٹھے، گنجے کو ڈنڈے مارے اور اس کا سارا جسم توڑ تاڑ کر لوٹ گئے۔ بوڑھی عورت کا بھی ایک پیر توڑ ڈالا، گھر کی گھاس اور پتوں کا پردہ بھی اجاڑ کر چل دیے۔

گنجا پورے ایک ہفتہ تک نہ ہل سکا۔ اپنی جھونپڑی میں سویا ہوا کراہتا رہتا۔ بڑھیا اس کے زخم پر مرہم رکھتی اور لعنت بھیجتی تھی۔ ہفتے کے دن گنجا اٹھ کر صحن میں توت کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھا کہ تھوڑا دل بہلائے۔ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے مرے کبوتروں کو کہاں دفن کرے کہ اپنے سر کے اوپر ایک آواز سنی۔ نظر اٹھا کر دیکھا کہ شہتوت کے درخت پر دو کبوتر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔

کبوتروں میں سے ایک کبوتر بولا: عزیز بہن، تم اس لڑکے کو پہچانتی ہو؟

دوسرا بولا: نہیں پیاری بہن۔

پہلے کبوتر نے کہا: یہ وہی لڑکا ہے جس کی وجہ سے بادشاہ کی بیٹی مریض ہو گئی ہے۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو حکم دیا، وزیر نے اپنے نوکروں کو بھیج کر اس کے کبوتروں کو مار ڈالا ہے اور خود اسے بہت مارا ہے اور آج تک اس حال میں چھوڑ رکھا ہے۔ لڑکا اس فکر میں ہے کہ کبوتروں کو کہاں دفن کرے!

دوسرا کبوتر بولا: کیوں گھبرا رہا ہے؟

پہلا کبوتر بولا: بس تم ہی بتاؤ کیا کام کرے!

دوسرا کبوتر بولا: جب ہم یہاں سے اڑیں گے تو ہمارے پیروں کے نیچے سے چار عدد پتیاں گریں گی۔ اگر انھیں اپنی بکری کو کھلا دے اور بکری کا دودھ کبوتروں کی گردن پر مالش کرے، کبوتر زندہ ہو جائیں گے اور ایسے کام کریں گے جو آج تک کسی کبوتر نے نہ کیا ہوگا!

پہلا کبوتر بولا: کاش کہ لڑکا ہماری باتیں سن لے!

کبوتر ہوا میں اڑ گئے۔ چار عدد چڑیاں ان کے پیروں کے نیچے سے گر پڑیں
گنجے نے انھیں      لیا اور روٹی میں بکری کو کھانے کے لیے دیا جس سے اس کو
خوب دودھ آگیا۔ گنجا پتیلی لے آیا۔ بکری کا دودھ دوہا اور اس دودھ کو کبوتروں
کی گردن پر ملا۔ کبوتروں نے ہاتھ پیر مارے، زندہ ہو گئے اور گنجے کے گرد چکر
کاٹنے لگے۔

بڑھیا نے کبوتروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنی اور باہر آئی۔ گنجے
نے کبوتروں کا حال کہہ سنایا۔ بڑھیا نے کہا: پیارے بیٹے! اب کبوتر بازی سے
توبہ کرو۔ اگر اس بار پھٹ پڑ گیا تو بادشاہ تجھ کو مار ہی ڈالے گا۔

گنجے نے کہا: اماں، میرے کبوتر اب وہ کبوتر نہیں ہیں جنھیں تو نے اب
تک دیکھا تھا۔

دیکھو......

اس وقت گنجے نے اپنے کبوتروں سے کہا، میرے خوبصورت کبوترو
ایک کام کرو کہ میرا دل خوش ہو جائے اور میری اماں بھی راضی ہو جائے۔
کبوتروں نے دائرہ بنایا۔ غٹرغوں کی اور یکایک فضا میں پرواز کرنے
لگے۔ گنجا اور اس کی ماں حیرت میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر گزر گئی۔ کبوتروں کا
کوئی پتہ نہ تھا۔ بڑھیا بولی: یہی تمہارے کبوتروں کی وفاداری... بے
بڑھیا کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کبوتر آسمان میں نظر آئے۔ وہ ایک
ٹاٹ کی ٹوپی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ٹوپی گنجے کو دی۔ بڑھیا نے کہا، عجیب قیمتی
سوغات تمہارے لیے لائے ہیں۔ اب دیکھ تیرے سر پر ٹھیک آتی ہے یا نہیں۔
گنجے نے ٹاٹ کی ٹوپی اپنے سر پر رکھی اور بولا: ہاں مجھے ٹھیک آرہی ہے نا؟

بڑھیا بولی: بیٹا تو کہاں ہے؟

گنجا بولا: میں یہیں ہوں۔

بڑھیا بولی: ٹوپی مجھے دے ذرا میں بھی دیکھوں۔

گنجے نے ٹوپی اتار کر اپنی اماں کو دی۔ بڑھیا نے اسے اپنے سر پر رکھا
گنجا چلایا: اماں تم کہاں گئی؟

بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا، گنجا حیران و پریشان چاروں طرف دیکھ رہا
تھا۔ یکایک دیکھا کہ اس کی اماں کے چرخہ کاتنے کی آواز آرہی ہے۔ دوڑ کر
کمرے میں گیا، دیکھا کہ چرخا خود بخود اپنی چرخی پر گھوم رہا ہے اور روئی کات
رہا ہے۔ اب وہ سمجھ گیا کہ ٹاٹ کی ٹوپی کیا خصوصیت رکھتی ہے۔ بولا: اماں اب
مجھے اور پریشان نہ کر، ٹوپی دے جاؤ، تھوڑا کھانے پینے کا سامان لے آؤں،
میں بھوک اور کمزوری سے مرجانا چاہتا ہوں۔

بوڑھی عورت بولی: قسم کھا کہ حرام کے مال کو ہاتھ نہیں لگائے گا، میں
ٹوپی دے رہی ہوں۔

گنجا بولا: میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا
جو میرے لیے حرام ہیں۔

بڑھیا نے ٹوپی گنجے کو دی اور گنجے نے اسے سر پر پہن کر باہر کی راہ لی
دوسری طرف کے چند محلوں بعد حاجی علی پارچہ باف کا گھر تھا۔ کئی
کارخانے تھے جہاں کئی سو مزدور، نوکر اور نوکرانیاں تھیں۔ گنجا راستہ چلا جا
رہا تھا اور اپنے آپ سے بات کرتا جاتا: اچھا، پیارے گنجے حساب لگا کر بتا
کہ حاجی علی کا مال تیرے لیے حلال ہے یا نہیں۔ حاجی علی آخر پیسے کہاں سے
لاتا ہے؟ اپنے کارخانوں سے۔ کیا خود کام کرتا ہے؟ نہ۔ وہ کالے سفید کو ہاتھ
نہیں لگاتا ہے۔ وہ صرف کارخانہ کا منافع وصول کرتا ہے اور اچھی طرح
زندگی گزارتا ہے۔

بس پھر کون کام کرتا ہے اور منافع دیتا ہے پیارے گنجے؟ اپنا بھیجا
ٹھیک سے استعمال کر۔ میں تجھ سے ایک چیز پوچھتا ہوں، ٹھیک جواب دینا
بتاؤ، دیکھیں اگر لوگ کام نہ کریں، کارخانے کیسے چلیں گے؟ جواب: بالکل
نہیں! بند ہو جائیں گے۔ کیا اس وقت بھی کارخانے منافع دیں گے؟ جواب:
کسی طرح نہیں۔ پس پیارے گنجے نتیجہ کیا ہوگا؟ ان سوالوں اور جوابوں
سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مزدور کام کرتے ہیں لیکن ان کا تمام منافع حاجی
علی ہڑپ کر جاتا ہے اور صرف تھوڑا سا حصہ انھیں دیتا ہے۔ بس کیا اب

حاجی علی کا مال اس کا نہیں ہے۔ میرے لیے حلال ہے۔

گنجا نہایت اطمینان سے حاجی علی کپڑا بیچنے والے کار خانہ دار کے گھر میں داخل ہوا۔ چند نوکر، مائیں اور نوکر باہری صحن میں آنے جانے میں مصروف تھے۔ گنجا ان کے بیچ سے گزر گیا اور کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ صحن میں حاجی علی اپنی کئی عدد بیویوں کے ساتھ حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے میز پر رکھا ہوا شام کا ناشتہ نوش فرما رہے تھے۔ چائے، بسکٹ اور شیرمال کا دور چل رہا تھا۔ گنجے کے منہ میں پانی آ گیا۔ سامنے گیا اور ایک بڑا سا ٹکڑا چننے لیے اٹھا لیا۔ حاجی علی دیکھ رہے تھے کہ ان کے مربّہ اور شہد تقریباً آدھا غائب ہو گیا ہے۔ فوراً ہی بسم اللہ کہا، دعا پڑھنا اور تسبیح دہرانا شروع کر دیا۔ گنجے نے حاجی جی کی چائے اٹھائی اور غٹا غٹ پی گیا۔ اب تو عورتوں نے اور حاجی علی نے ایک زوردار چیخ ماری اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کمرے کی طرف بھاگے۔ گنجے نے سارا شہد اور شیرمال چٹ کر ڈالا اور چند پیالی چائے پی کر اٹھا کر ذرا کمروں کے اندر کی سیر کرے۔ کمروں کے اندر اچھی قیمتی چیزیں بھری تھیں کہ گنجا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا، چاندی سونے کے چوکھٹے والا سنہری آئینے، قالین اور پردے، یہاں سے وہاں تک، چاندی کے اور شیشے کے برتن اور بہت بہت سی دوسری چیزیں۔ گنجے کو جو چیز پسند آتی تھی اپنی جیب کے اندر رکھتا جاتا تھا۔

قصہ، آخر حاجی علی کے بڑے صندوق کی کنجی تلاش کر لی۔ رات کو جب تمام لوگ سوئے ہوئے تھے، صندوق کا کنڈا کھولا اور جتنا بھی ہو سکتا تھا روپیہ نکالا اور باہر چلا آیا۔ دوسرے اور امیروں کے گھر بھی دھاوا بولا اور آدھی رات گزر رہی تھی کہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ تھوڑا پیسہ اپنے لیے رکھ لیا اور بقیہ راستے میں بیٹھے ہوئے غریبوں کو بانٹ دیا۔

غریبوں کے گھروں کی کنڈی کھٹکھٹاتا، گھر کا مالک دروازہ پر آتا تو گنجا کہتا، یہ تھوڑا سا سونا اور دو ہزار روپیہ لے لو اور اپنے بال بچوں پر خرچ کرو۔ یہ تمہارا مال ہے۔ کسی اور سے نہیں کہنا۔

گھر کا مالک جب تک آتا کر دیکھے کہ دروازہ کے پاس کون ہے اور آوازیں کدھر سے آرہی ہے۔ دیکھتا تھا کہ ایک شخص سوتا اور بہت سارا روپیہ فرش پر پڑا ہوا ہے اور وہاں اس پاس کسی شخص کا نام و نشان نہیں۔

گنجا رات گئے گھر پہنچا۔ بوڑھی عورت سوئی نہیں تھی بیٹے کے انتظار میں پھر جاگتے جا رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی جھونپڑی کے اندر کبوتر اپنے پروں کے اندر اپنے سروں کو چھپائے یہاں وہاں بیٹھے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ گنجا چپکے سے جھونپڑے میں آیا اور سرہانے اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر اپنی ٹوپی اتار دی۔ جب بڑھیا نے اپنے بیٹے کو دیکھا خوش ہو کر بولی: اس رات گئے تک کہاں تھا بیٹا!

گنجا بولا: حاجی علی پارچہ باف کے گھر میں لوگوں کا مال اس سے لے رہا تھا۔ بوڑھی عورت نے اس کے لیے شوربا ابالا۔ گنجا بولا: میں نے اتنا شہد اور شیرمال کھایا ہے کہ اگر پورے ایک ہفتے بھی میں اپنے منہ میں کچھ نہ رکھوں پھر بھی میں بھوکا نہیں ہوں گا۔

بڑھیا نے خود اکیلے ہی رات کا کھانا کھایا اور بکری کا دودھ پیا اور پھر دونوں سو گئے۔ گنجے نے اپنا تمام شوربا کبوتروں کے سامنے ڈال دیا۔

دوسرے روز صبح سویرے ٹوپی سر پر رکھی اور کوٹھے پر جا کر کبوتروں کو اڑانا اور سیٹی بجانا شروع کر دیا۔ ایک لمبی لکڑی بھی اپنے ہاتھ میں سے رکھی تھی جس کا ایک سرا لوہے دار تھا۔

بادشاہ کی لڑکی مریض ہو کر کھڑکی کے پاس سوئی تھی اور آنکھیں چھت کی طرف تھیں یکایک دیکھا کہ گنجے کے کبوتر اڑنے لگے اور سیٹی کی آواز سنائی دی لیکن خود اس کا پتہ نہیں ہے صرف کبوتر اڑانے کی لکڑی دکھائی دے رہی تھی جو ہوا میں ادھر ادھر آ جا رہی تھی اور کبوتروں کو کھلا رہی تھی۔

وزیر کے نوکروں نے وزیر سے کہا اور وزیر نے بادشاہ کو خبر دی کہ گنجے نے پھر سر اٹھایا ہے اور ہو سکتا ہے کہ شاہزادی کا حال اور خراب ہو جائے۔ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ جائے کبوتروں کو پکڑ کر مار ڈالے۔

ادھر شاہزادی گنجے کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک رازدار کنیز کو بوڑھی عورت کے پاس بھیجا کہ کچھ ادھر پتہ چلائے اور بڑھیا کو یہ بتائیں کہ بادشاہ کی بیٹی گنجے کے عشق میں بیقرار ہے کوئی ترکیب کرے۔

دوسری طرف سے حاجی علی اور دوسرے امیر روتے پیٹتے بادشاہ کے محل پر گئے کہ ہم لوگ تو مر گئے، ہماری زندگی برباد ہو گئی۔ نہیں تم کس دن کے لیے بادشاہ ہو، اپنے سپاہیوں کو چوروں کی تلاش میں بھیجو۔ مال ہمیں واپس دلاؤ......

انھیں یہیں رہنے دو، میں تمھیں گنجے کے گھر لے چلتا ہوں۔

گنجا سر پر ٹوپی رکھے کبوتروں کو اڑا رہا تھا اور بڑھیا سر پر دوپٹہ اوڑھے چھت کے نیچے اون کات رہی تھی اور بکری صحن میں چوکڑی گھوم رہی تھی اور شہتوت کے گرتے ہوئے پتوں کو چن چن کر کھا رہی تھی جو تیز ہوا سے زمین پر گر رہے تھے۔

بڑھیا نے یکایک سر اٹھا کر دیکھا کہ بکری اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی ہے، بڑھیا نے بھی بکری سے نگاہیں ملائیں۔ معلوم ہوا کہ بکری کہہ رہی تھی کہ گنجا اور کبوتر خطرہ میں ہیں۔ جاؤ میرے واسطے شہتوت کی پتیاں لاؤ میں کھاؤں اور تمھیں بتاؤں کہ کیا کام کرنا چاہیے۔

بڑھیا نے اب دیر نہیں کی، چل کر لکڑی سے توت کے پتے مار مار کر گرانے لگی۔ بکری نے کھایا اور اپنا پیٹ پھلالیا پھر بڑھیا کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا معلوم ہوتا تھا کہہ رہی ہے کہ میں شکریہ ادا کرتی ہوں اب تو اندر جا میں خود گنجے اور کبوتروں کی مدد کے لیے چھت پر جا رہی ہوں۔

بڑھیا کچھ نہ بولی اور اندر چلی گئی۔ بکری چھت پر جانے والی سیڑھی کے زینے چڑھتی ہوئی اوپر گئی اور سوکھے تنکوں کے ڈھیر کے پاس جا کر پھر کانٹے کھانے لگی۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ وزیر کے چند ملازمین بڑھیا کے صحن میں گھس آئے کبوتر اڑانے والی لکڑی ہوا میں ادھر ادھر لہرا رہی تھی جو کوئی اوپر چڑھنا چاہتا تھا اسے لکڑی مار مار کر نیچے گرا دیتی تھی۔ آخر کار سب

وزیر کے پاس لوٹے بادشاہ زادی تمام چیزیں کھڑکی کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی اور اس کی طبیعت کچھ اچھی ہو چلی تھی۔ یہ منظر اس کے دل بہلانے کا سامان تھا۔

بادشاہ، حاجی علی اور دوسرے کارخانہ دار اور پیسے والے بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے اور حیران رہ گئے تھے کہ کون سا زبردست ڈاکو ہے کہ ایک ہی رات میں اتنے گھروں پر ڈاکہ ڈالا اور اتنا مال اور روپیہ لوٹ کر لے گیا۔ اسی وقت وزیر آیا اور خبر دی: بادشاہ سلامت! عجیب چیز واقع ہوئی ہے گنجا خود نہیں ہے لیکن اس کے کبوتر اڑانے والی لکڑی چھت پر کبوتر اڑا رہی ہے اور کسی کو کبوتروں کے نزدیک جانے نہیں دیتی ہے۔

بادشاہ بولا: گنجے کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔

وزیر بولا: عرض کیا کہ گنجے کا کہیں پتہ نہیں ہے، جھونپڑی میں اس کی ماں اکیلی ہے اور گنجے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔

حاجی علی کرخندار نے کہا: بادشاہ جو کچھ ہے وہ گنجے کے سر کے پیچھے ہے۔ اس کے نشانوں سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم تمام لوگوں کے گھروں میں بھی گنجے ہی نے دھاوا بولا ہے۔

پھر انھوں نے اپنی شہد شیرہاں اور چائے کے غائب ہو جانے کا قصہ کہہ سنایا۔ ایک دوسرے امیر نے کہا: میری آنکھوں کے سامنے میری بیوی کا گلوبند اس کی گردن سے اتر گیا۔ معلوم ہوتا تھا بھاپ بن کر اڑ گیا۔

ایک اور بولا: میں نے بھی دیکھا کہ ہماری سنہری فریم کا آئینہ طاقچے پر سے فضا میں بلند ہوا اور غائب ہو گیا۔ جب تک میں ہوش میں آ کر دوڑا ہوں آئینہ معلوم ہوا آئینہ ہے ہی نہیں۔ حاجی علی صحیح کہتے ہیں کہ یہ تمام کام گنجے کی کارستانی ہے۔

بادشاہ ناراض ہو کر حکم دینے لگا کہ فوج تیار کی جائے تاکہ گنجے کو گھیر لیا جائے اور اسے زندہ یا مردہ پکڑ لائے۔

ٹھیک اسی وقت بادشاہ زادی اپنی رازدار لونڈی کے ساتھ بیٹھی

ہوئی بات چیت کر رہی تھی۔ لونڈی جو کہ جلدی ہی بڑھیا کے پاس سے لوٹ تھی کہہ رہی تھی: خانم، گنجے کی اماں نے بتایا ہے کہ گنجا زندہ ہے اور اس کا حال بھی بہت اچھا ہے۔ آج میں اسے بھیجوں گی کہ وہ بادشاہ زادی کے پاس جا کر خود بات چیت کرے۔۔۔۔

بادشاہ کی بیٹی تعجب سے بولی: گنجا میرے یہاں آئے گا؟ آخر کس طرح سارے پہرے داروں اور سپاہیوں کے بیچ سے گزر کر آ سکتا ہے؟ کاش کہ وہ آ سکے!

لونڈی بولی: شاہزادی صاحبہ، گنجے ایک ہزار ایک فن جانتے ہیں۔ رات میں ہم ان کا انتظار کریں گے یقیناً آئے گا۔

اسی وقت کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ فوج نے گنجے کے گھر کو انگوٹھی کے نگینے کی طرح گھیر رکھا ہے۔ بادشاہ زادی بولی: اگر ہزار آدمی بھی ہونگے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا میرا بیچارہ گنجو۔۔۔۔

اب کبوتر چھت پر بیٹھے ہوئے تھے اور دانہ چگ رہے تھے۔ کبوتر اڑانے کی لگی سیدھی کھڑی ہوئی تھی۔ بکری برابر کانٹا کھائے جا رہی تھی اور زہر دستے اور سر توڑ دینے والی گولیاں ٹپک رہی تھی۔

فوج بالکل تیار کھڑی ہوئی تھی۔ سردار زور زور سے کہہ رہا تھا: او گنجے، تیرے اگر ہزار جان بھی ہونگی تو ایک جان بھی نہ بچا سکے گا۔ سوچا تم نے۔۔۔ جتنی جلدی ہو اپنے آپ کو حاضر کر دے ورنہ تیرا بدن ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔۔۔۔

بڑھیا جھونپڑے میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔ اس کے چرخے کی آواز بھی اب کان میں نہیں آ رہی تھی۔ چھت کے کونے سے جھانک کر دیکھا لیکن کچھ دیکھ نہ پائی۔

اس وقت گنجا اپنے کبوتروں سے کہہ رہا تھا: میرے خوبصورت کبوترو! مگر تم دیکھتے نہیں ہو، بکری کیا کر رہی ہے؟ تم لوگوں کے لیے گولیاں بنا رہی ہے۔ کوئی کام کرو۔ میرا دل خوش کرو۔ اور میری اماں کو منا لو۔۔۔

کبوتروں نے دائرہ بنالیا اور غوطوں کر کے فضا میں اڑے اور غائب ہو گئے ...

فوج کے کپتان نے دوبارہ کہا: او گنجے! یہ اعلان آخری بار تیرے لیے ہے۔ ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ جادو بازی اور بدمعاشی کو چھوڑ دے تو ہمارے ساتھ نہیں ٹکرا سکتا ہے۔ آخر کار پکڑا جائے گا اور پچھتائے گا اور کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جہاں کہیں بھی ہو حاضر ہو جا:

گنجا چیخا: جناب کپتان صاحب! مجھے معاف فرمائیے کہ میں نے آپ کو حیران کیا۔ میں اپنی بنیان میں پیوند لگا رہا تھا ورنہ آپ کے حضور میں حاضر ہو جاتا۔ آپ ایک سگریٹ جلاتے میں آیا۔

کپتان خوش ہو گیا کہ بغیر کسی پریشانی کے گنجے کو پکڑ لیا۔ ایک سگریٹ جلایا اور بولا: عجیب بدمعاش ہے تو! تمہاری آواز کہاں سے آرہی ہے؟

گنجا بولا: تمہاری اماں اور ابا کی قبر سے۔

فوج کا سردار سخت غصہ ہوا اور چلایا: بکواس بند کر!.... جانتا ہے میں کون ہوں، میرے ساتھ مذاق کرنا چاہتا ہے؟

اسی وقت سیکڑوں کبوتر آسمان کے چاروں طرف سے آتے دکھائی دیے۔ اس گنجے کے اپنے کبوتر خود بیچ میں تھے بکری تیز تیز کلتے چبا رہی تھی اور گولیاں بھی جا رہی تھی۔

گنجے نے ایک گولی اٹھائی اور چلایا: جناب کپتان صاحب! دیکھیے میں کہاں ہوں! اور گولی کپتان کی طرف پھینکی۔ کپتان نے اپنا سر اوپر اٹھایا رکھا تھا اور سگریٹ ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ فضا میں دیکھ ہی رہا تھا کہ گولی لگی اس کے دونوں بھنووں کے بیچ اور پھر اس کی چیخ بلند ہوئی۔

کپتان اپنی جگہ سے گر پڑا لیکن کبوتروں نے موقع نہیں دیا ان پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ گولیاں اپنے چونچوں میں لیتے اور فوجیوں کے سروں اور چہروں پر گرا دیتے تھے۔ جس کسی کے سر پر بھی گولی لگ گئی اس کا سر پھوڑ دیتی۔ نداف میں فوج پیچھے ہٹ گئی۔ گنجے نے بکری اور کبوترو

کو چھت سے لیا اور نیچے آیا ، کچھ اور کبوتر بھی ساتھ آ گئے تھے ۔

بوڑھی عورت نے گنجے کے دیے ہوئے پیسوں میں سے رات کا کھانا پکایا لیکن روزانہ کی طرح معمولی کھانا تھا ۔ سوکھی روٹی کا بڑا ٹکڑا یا تھوڑا گھونٹا ہوا شوربا یا پھر وہی خالی روٹی کہ جس پر پانی پھیرا ہوتا ۔ کبوتروں کے لیے گیہوں خریدا تھا ، بکری نے بھی بھوسی اور جو کھایا ۔

رات کا کھانا کھا کر بڑھیا نے گنجے سے کہا : اب اپنی ٹوپی سر پر پہن لے اور بادشاہ کی بیٹی کے پاس جا ۔ میں نے اسے قول دیا ہے کہ تجھے اس کے پاس بھیجوں گی ۔

گنجا بولا : اماں آخر ہم کہاں اور بادشاہ کی بیٹی کہاں !

بڑھیا نے کہا : اب تو جا اور دیکھ کہ کیا کہتی ہے !

گنجے نے ٹوپی اپنے سر پر رکھی اور چلا گیا ۔ پہرہ داروں اور سپاہیوں کے بیچ سے گزر گیا اور بادشاہ زادی کے کمرہ میں داخل ہوا ۔ بادشاہ زادی اپنی رازدار لونڈی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی ۔ اس کی طبیعت اچھی ہو گئی تھی کنیز سے کہہ رہی تھی اگر گنجا جان لے کہ میں کس قدر اس کا خیال کرتی ہوں ، تو ایک لمحہ بھی دیر نہ کرے گا لیکن مجھے ڈر ہے کہ پہرہ داروں کے ہاتھ گرفتار ہو کر مار ڈالا نہ جائے ، میرا دل دہل رہا ہے ۔

کنیز بولی ، ہاں خانم : میں بھی ڈر رہی ہوں ، بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ آج رات پہرہ دار دگنے کر دیے جائیں اور وزیر زادے کو ان کا افسر بنا دیا ہے ۔

گنجا آیا اور شاہزادی کے پاس بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا ۔ رات کا کھانا مرغ ، بریانی ، قسم قسم کی چٹنیاں ، مربے ، کوکو اور شوربا وغیرہ ۔ خانم شہزادی اور کنیز نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلہ پر تمام چیزیں تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہیں اور مرغ کی ایک ران اٹھائی گئی اور غائب ہو گئی ۔

ملازمہ بولی : شہزادی تم جو کچھ چاہو سوچ لو مجھے یقین ہے کہ گنجا کمرے کے اندر ہے ، یہ کام اسی کا ہے ۔ بڑھیا نے کہا تھا نہ کہ گنجے ہر چیز جانتے ہیں ۔ ۔ ۔

شاہ زادی خوش ہو کر بولی: پیارے گنجو: اگر کمرے میں ہو تو ظاہر ہو جاؤ میرا دل تمہارے لیے خون ہو گیا ہے۔

گنجے نے آواز نہیں نکالی۔ کنیز بولی: شہزادی ممکن ہے کہ میری وجہ سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔ میں جاتی ہوں اب اور پہرہ داروں کی خبر گیری کرتی ہوں ....

جیسے ہی لونڈی گئی گنجا اپنی ٹوپی اتار کر سامنے آگیا۔ بادشاہ کی بیٹی نے اچانک دیکھا کہ گنجا اس کے پاس بیٹھا ہوا ہے، خوش ہو کر بولی: گنجے جان، مگر تم نہیں جانتے کہ میں تمہاری بیقرار عاشق ہوں؟ مجھے یہاں سے آزاد کراؤ۔ بادشاہ چاہتا ہے کہ وزیر زادے سے میرا بیاہ کر دے۔

گنجا بولا: آخر شہزادی، تم ایک بادشاہ کی بیٹی ہو، کس طرح تم ایک دھوئیں دار جھونپڑی میں بند ہو سکو گی؟

بادشاہ کی لڑکی بولی: میں اگر تمہارے ساتھ رہوں تو تمام چیزیں برداشت کر سکوں گی۔ گنجے نے کہا: میں اور اماں بڑی مشکل سے اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ تمہارا پیٹ کس طرح بھریں گے۔ تو خود بھی شاہ زادی ہے اور کوئی کام کرنا نہیں جانتی ہے۔

شاہ زادی نے کہا: میں ایک کام سیکھ لوں گی۔

گنجا بولا: کونسا کام؟

لڑکی بولی: جو کام بھی تم کہو گے ......

گنجا بولا: اب سمجھا: اپنی اماں سے کہوں گا کہ تجھے اون کاتنا سکھائے تم کچھ دن صبر کرو، میں آکر تمھیں خود بتاؤں گا کہ کب ہم لوگ یہاں سے نکل چلیں۔

گنجا اور شاہ زادی باتیں کرتے رہے اور میں تم کو بتاؤں کہ وزیر کا بیٹا جو پہرہ داروں کا سردار تھا اور شاہ زادی کا عاشق اس کا کیا بنا۔

جس وقت گنجا بادشاہ زادی کے یہاں آرہا تھا تو دیکھ لیا تھا کہ وزیر زادہ اپنی کرسی پر جھک کر سو گیا ہے۔ گنجے نے وزیر زادہ کے عشق کی نیند میں اس کا بھالا اور تلوار اٹھالی تھی اور اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ جب وزیر زادہ جاگا

تو اپنا اصلی روپ پایا تو سمجھ گیا کہ گھنا آیا اور کام کر گیا۔ فوراً تمام پہرے داروں کو شاہزادی
کو کمرہ کی طرف بھیجا، پہرے دار نے دروازہ بند پایا تو دیکھا زبردستی ہٹا کر
دروازہ کھول لیا اور گھنے کو شاہزادی کے پاس بیٹھا ہوا پایا۔ فوراً دروازہ بند
کر دیا اور چلایا، گھنا یہاں ہے جلد آ جاؤ گھنا یہاں ہے ...

وزیر کا بیٹا اور دوسرے دوڑے دوڑے آئے۔ بادشاہ شور و غل
سن کر جاگ گیا اور تخت پر بیٹھ کر حکم دیا کہ گھنے کو زندہ یا مردہ اس کے پاس
لایا جائے۔

پہرے داروں کا سردار خود بھی وزیر زادہ تھا چند دوسرے سپاہیوں کے
ساتھ لڑکی کے کمرے میں گھس گئے۔ بادشاہ زادی اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی
اور کہانی پڑھ رہی تھی گھنے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ بس وزیر کے بیٹے نے جو کہ لڑکی کا عاشق
بھی تھا، اس سے پوچھا، شاہزادی! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ گھنا کہاں گیا ہے؟ پہرے دار
کہتا ہے کہ ایک منٹ قبل یہاں تھا۔

لڑکی نے سختی سے جواب دیا: کیا میرا باپ بالکل بے شرم ہو گیا ہے تمہیں اجازت
دے دی ہے کہ رات کے وقت بیمار لڑکی کے کمرے میں داخل ہو جاؤ اور تمہیں بھی
یہ جرأت ہو گئی ہے کہ اس قسم کی باتیں میرے سامنے کرو۔ فوراً باہر نکل جاؤ!

وزیر زادہ نے ادب اور احترام سے کہا: شہزادی صاحبہ، خود بادشاہ
کا حکم ہے کہ ہم کمرہ کا کونا کونا چھان ماریں۔ میں افسر ہوں اور میرا کوئی گناہ نہیں
پھر سارا کمرہ چھان مارا۔ کوئی چیز نہیں ملی لیکن وزیر زادہ کی تلوار اور بھالا
جو گھنا اپنے ساتھ لے آیا تھا اور جنہیں چارپائی کے نیچے چھپا دیا تھا، وزیر زادہ نے
پوچھا جناب شہزادی، یہ میری چیزیں یہاں کیسے آ گئیں؟ مجھ سے لے اڑا تھا۔ اگر وہ خود یہاں
نہیں ہے تو یہ چیزیں یہاں کیسے ہیں؟ میں بادشاہ سلامت کی خدمت میں
عرض کروں گا۔

اس وقت گھنا بادشاہ زادی کے پاس کھڑا تھا اور اس کے کان میں کہہ
رہا تھا تم نہ ڈرو شاہزادی! اپنے چہرے پر کچھ ظاہر نہ کرو، میں جلد ہی
دوبارہ تمہارے پاس آؤں گا۔

بعد میں پہرہ داروں کے بیچ سے گزرتا ہوا دروازہ پر پہنچا جہاں چار آدمی دروازہ پر ہی کھڑے تھے اور نکل جانا ممکن نہ تھا۔ چاہا کہ چپکے سے نکل جائے کہ اچانک اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرا گیا اور اس کی ٹوپی گر پڑی۔

گنجے نے کتنا ہی چاہا کہ ٹوپی حاصل کر لے اور کہا کہ بڑا اندھا ہے اگر میں بادشاہ کے سامنے ننگے سر جاؤں لیکن وزیر زادہ نے ایک نہ سنی۔

بادشاہ غصہ میں بھرا ہوا تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور انتظار کر رہا تھا جس وقت گنجا اس کے تخت کے سامنے پہنچا تو چلایا: حرام زادہ، سارے جرم تو نے کیے، لوگوں کے گھر پر ڈاکے ڈالے، میرے پہرہ داروں کو سلا دیا لیکن کس حوصلہ کے ساتھ اب تو میری لڑکی کے کمرہ میں گھسا، ابھی ابھی حکم دیتا ہوں کہ میرا وزیر آئے اور پگھلتا ہوا سیسہ تیرے حلق میں اتار دیا جائے۔

گنجا بولا: بادشاہ عالی، جو کچھ حکم ہو میں راضی ہوں لیکن پہلے حکم دیجیے میرا ہاتھ کھول دیں اور میری ٹوپی مجھے دے دیں۔

وزیر زادے نے چاہا کہ ٹوپی نہ دے لیکن ہمت نہ ہوئی کہ بادشاہ کے سامنے زبان کھولے، ٹوپی دے دی اور اس کی ہتھکڑی کھول دی۔ گنجے نے ٹوپی سر پر رکھی اور چھو منتر ہو گیا۔ بادشاہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور چلایا کہاں گیا لونڈا؟ کیوں آنکھ مچول کھیل رہا ہے!

وزیر کے بیٹے نے ڈرتے ڈرتے کہا، قربان ہوتا ہوں، کہیں نہیں گیا ٹوپی کے نیچے چھپ گیا، حکم دیجیے تمام دروازے بند کر دیے جائیں ابھی باہر جا نہیں سکا ہے۔

جب تک گنجے نے چاہا کہ اپنی جگہ سے ہلے اور چمپت ہو جائے لیکن دیکھا کہ ٹھیک ایک کٹہرے کے اندر کھڑا ہوا ہے، پہرہ داروں نے بادشاہ کا گھیر لیا اور راستہ سخت کر دیا کبھی کسی سوراخ سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔

جب بادشاہ نے دیکھا کہ گنجا پکڑ میں نہیں آ رہا ہے تو جلاد کو بلایا، جلاد آیا؟ بادشاہ نے حکم دیا۔ جلاد، حرام زادے وزیر زادے کی گردن اڑا دو۔ وزیر زادے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے درخواست کی، بادشاہ بولا:

مردار تو تو جانتا تھا کہ گنجے کی ٹوپی کس قسم کی ٹوپی ہے کیوں تو نے مجھے نہیں بتایا؟ ....
جلاد تم یں دیکھا اور اس کی گردن اڑا دے ۔

اور اس طرح وزیرزادہ آدھی رات گئے مار ڈالا گیا ۔

اب میں تمھیں شاہزادی کے بارے میں بتاتا ہوں ۔ جب دیکھا کہ گنجا مصیبت میں پھنس گیا اور وزیرزادہ مار ڈالا گیا ، اپنی لونڈی سے بولی :

تو کچھ جانتی ہے کہ اگر وزیر آئے گا اور ہماری جان بھی ہلاکت میں پڑ جائے گی ۔ پس کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے رہیں کہ کیا ہوگا ؟ چلو ہم لوگ گنجے کی ماں کے پاس چلیں ۔ شاید کوئی کام بن جائے ۔ میرا پیارا گنجو کہیں میرے ہاتھوں سے چھن نہ جائے ۔

پہرے داروں کے پاس اتنی بھیڑ بھاڑ تھی کہ وہ ان کے جانے کی طرف توجہ نہ دے سکے ۔ بڑھیا عورت اکیلے گھر میں بیٹھی ہوئی اون کات رہی تھی اور بکری اور کبوتر موجود تھے ۔ بادشاہ کی بیٹی نے بڑھیا سے کہا کہ گنجا کس طرح مصیبت میں پھنس گیا ہے اور اب ایک کام کرنا چاہیے ۔

بڑھیا نے تھوڑا سوچ بچار کیا اور جا کر بکری کو جگایا ، کبوتروں کو اٹھایا اور بولی : اے میری داڑھی والی چالاک بکری اور اے میرے خوبصورت چھوٹے کبوترو میرا بیٹا بادشاہ کے محل میں مصیبت میں گرفتار ہے کوئی کام کرو ، میرے گنجو کا دل خوش کرو اور مجھے راضی کر دو ۔ یہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور میری بہو بننا چاہتی ہے اسے غم سے چھٹکارا دلاؤ ۔ ....

بکری چارا چاہتی تھی ۔ لڑکیاں اور بڑھیا مل کر اس کے لیے شہتوت کے پتے اور کا شالائیں ۔ کبوتر گئے اور اپنے دوستوں کو لائے ۔ بکری نے کھانا اور گولیاں بنانا شروع کر دیا ۔ بڑھیا نے تندور میں آگ جلائی اور اس پر توا رکھا کہ کبوتروں کے لیے گیہوں بھونے ۔

کبوتر گیہوں کھا رہے تھے اور گولیوں کو اٹھا رہے تھے اور ہوا میں اونچے اڑ رہے تھے اور انھیں پھینکتے تھے جو پہرے داروں اور فوجیوں کے سر پر گر رہے تھے ۔ رات کے اندھیرے میں کسی سے کچھ بن نہ پڑتا تھا ۔

اب وزیر بھی واقعہ سے باخبر ہو کر آگیا تھا۔ بادشاہ سے بولا:
بادشاہ سلامت! اگر اسی طرح دو ایک گھنٹہ یہ کام جاری رہتا ہے تو کبوتر تمام گھروں کو مسرت میں بدل کر رکھ دیں گے۔ اچھا ہے کہ ہم گنجے کو آزاد کر دیں پھر ہم بیٹھ کر کوئی مناسب اور معقول ترکیب سوچیں۔
بادشاہ کو وزیر کی یہ بات پسند آئی۔ حکم دیا کہ دروازہ کھول دیں۔ اور خود زور زور سے بولا: اے گنجے، آ اور یہاں سے بھاگ جا۔ آخر کار ایک روز تم سے سمجھوں گا۔
چند منٹ خاموشی سے گزرے۔ گنجا صحن سے چلایا۔ قربان جناب عالی! اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کی خدمت میں عرض گزار رہا ہوں کہ کہیں بھی اپنے منیجر کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرتے ہیں۔ . . .
بادشاہ بولا: گدھے، تم کہاں اور بادشاہ کی بیٹی سے بیاہ کہاں؟
گنجا بولا: بادشاہ سلامت اپنی بیٹی مجھ سے بیاہ دیجیے۔ میں حکم دوں گا اور کبوتر خاموش ہو جائیں گے میں اور تمہاری بیٹی ایک دوسرے کے عاشق ہیں۔
بادشاہ بولا: میں اب ایسی بے حیا بیٹی کو اپنے پاس رکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ ابھی اسی وقت اس کو نکالتا ہوں۔ . . . .
بادشاہ نے اپنے کچھ نوکروں کو بادشاہزادی کے یہاں بھیجا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیں۔ نوکر گئے اور لوٹ کر آئے۔ بادشاہ سلامت لڑکی تو چلی گئی۔
گنجا اور کچھ نہ بولا: اور کبوتروں کو ایک اشارہ کرتا ہوا اپنے گھر گیا جہاں اس کی اماں، شہزادی اور اس کی ملازمہ دودھ گرم کر کے کھا رہے تھے۔

• • •

گنجے نے ان تھوڑے سے مال اور زیورات سے جو شہزادی لائی تھی اور مدد سے جو اس کی اماں اور خود اس نے اکٹھا کیا تھا، ایک اچھا مکان بنایا اور اطمینان کی زندگی گزار رہا تھا تو کبھی کبھی یاں کاٹتا اور کبوتر اڑاتا تھا اپنی بکری کو شہتوت کے پیڑ کے نیچے باندھتا۔ اس کی بیوی اور اماں اون بنتی اور اسی طرح

زندگی بتا رہے تھے ۔

باندی کو بھی آزاد کر دیا تھا اور ساجدہ نے بھی شادی کر لی تھی۔ وہ بھی ایک گھریلو بال بچوں والی ہو گئی تھی ۔

حاجی علی کارخانہ دار اور دوسرے لوگ اب بھی بادشاہ کے پاس آتے تھے اور گنجے کے خلاف شکایتیں کرتے تھے ۔ خاص طور سے یہ کہ اب بھی گنجا کبھی کبھی ان کے مال کو لوٹ لیتا تھا لیکن کبھی بھی کوئی چیز خود نہیں لیتا تھا ۔

بادشاہ اور وزیر بھی روزانہ بیٹھتے تھے گنجے اور کبوتروں کے لیے ترکیب سوچتے تھے اور دماغ لڑاتے تھے ۔ بادشاہ نے وزیر کے چھوٹے لڑکے کو پہرہ داروں کا سردار مقرر کر دیا تھا اور وزیر کا منہ بند کر دیا تھا کہ اپنے بڑے لڑکے کے مار ڈالے جانے کے بارے میں کچھ نہ بولے ۔ ۔ ۔

• • •

ہمارے کہانی کہنے والے کہتے ہیں کہ ہماری کہانی ختم ہو گئی، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری کہانی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایک دن ہم پھر اس کہانی کا سرا ڈھونڈھ لائیں گے ۔

ختم

۳۰ر جنوری ۸۱ء

# چقندر فروش لڑکا

کچھ سال پہلے جب ایک گاؤں میں ٹیچر تھا جہاں اسکول صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا جس میں صرف ایک کھڑکی اور ایک ہی دروازہ تھا۔ گاؤں سے سو گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ میرے ۳۲ طالب علم تھے ان میں سے دو لڑکے پہلی کلاس میں تھے اور آٹھ لڑکے دوسری کلاس میں پانچ عدد تیسری جماعت میں اور تین لڑکے چوتھی جماعت میں تھے۔ سب کے گھر اس کے آخری مہینوں میں بیچا گیا تھا۔ بچے دو تین پیسے چندہ دیتے تھے اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چار پانچ روز کو سب سے بہتر نتیجے ڈاکٹر کا جس لڑکوں کو کارخانوں جنگلوں اور پہاڑوں وہاں سے اکٹھا کر کے سب کامیاب ہوگئے تو تربیت دے کے بلا کے چالیس منٹ کے کارخانے یا حاجی گل فروش چلانے والے کے کارخانوں میں کام کرنے کے لیے جاتے تھے۔ بہت زیادہ تیز لڑکے شکل سے دس یا پانچ ریال روزانہ کما لیا کرتے تھے۔ یہ حاجی گل شہر سے آئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس میں تھا۔ شہر کے مزدور مہنگے پیسے مانگتے تھے اور چار تمان سے زیادہ مانگتے تھے لیکن یہاں کا بچہ اچھا مزدور پچیس سے تیس ریال مانگتا تھا۔

دس روز سے زیادہ نہیں ہوا تھا کہ میں گاؤں میں آیا تھا کہ برفباری ہوئی اور زمین پر برف جم گئی۔ ہم لوگوں نے دروازوں اور کھڑکیوں کے سوراخ پر کاغذ چپکا دیے کہ سردی اندر نہ آئے۔

ایک روز میں چوتھی کلاس اور تیسری کلاس کو املا بول رہا تھا۔ پہلی اور دوسری جماعت باہر تھی۔ دھوپ نکلی تھی اور برف نرم اور پانی ہونے والی تھی۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہا

تھا کہ بچوں نے ایک آدمی کو آ پکڑا، کتابیں اور چاروں طرف سے گھیر ڈالا کہ اس پر برف
کے گولے مار رہے ہیں۔ گرمیوں میں پتھر اور ڈھیلوں سے گنے کا پیچھا کرتے تھے اور جاڑوں
میں برف کے گولے بنا بنا کر۔

تھوڑی دیر بعد ایک باریک سی آواز دروازے کے پیچھے سے سنائی دی۔ اے چقندر
والا بابو... بکتا اور میٹھا چقندر والا ہے....

میں نے ماسٹر سے پوچھا! پیارے کا نام یہ کون ہے؟

ماسٹر بولا۔ کوئی اجنبی نہیں ہے جناب.... پھیری والا ہے جناب... جاڑوں میں
چقندر بیچتا ہے... کیا اس سے کہوں کہ اندر آجائے۔

میں نے دروازہ کھول دیا اور پھیری والا اپنی چقندر کی ٹوکری کے ساتھ اندر آ گیا
ایک پرانی سوتی شال سر اور چہرے پر لپیٹے ہوئے تھا۔ پیر کا ایک جوتا عام تھا اور دوسرا جوتا
چمڑے اور بالوں والا تھا۔ اس کا اوورکوٹ اس کے گھٹنوں کو چھو رہا تھا اور اس کے ہاتھ
کوٹ کی آستینوں میں چھپے ہوئے تھے اس کی ناک کا سرا ٹھنڈ کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔
اور تقریباً دس بارہ سال کی عمر تھی۔

سلام کیا اور ٹوکری کو زمین پر رکھ دیا۔ بولا۔ جناب عالی کیا مجھے اجازت دیں گے کہ ذرا
میں تاپنا ہاتھ سینک لوں؟

چقندر والے نے انگیٹھی کے پاس جا لیا۔ میں نے اپنی کرسی اسے پیش کی کہ بیٹھا نہیں، کہا:
نہیں جناب۔ اس طرح میں زمین پر ہی ٹھیک بیٹھ سکتا ہوں۔

بچے بھی پھیری والے کی آواز سن کر آ گئے تھے۔ کمرے میں بھیڑ ہو گئی تھی۔ سب کو میں نے
اپنی جگہ بٹھا دیا۔

پھیری والا جیسے ہی گرم ہوا، بولا۔ چقندر لیجئے جناب!

اور بغیر اس کے کہ میرے جواب کا انتظار کرے اپنے چقندروں کے پاس گیا اور ٹوکری پر رکھے
ہوئے گندے اور بدرنگ کپڑے کو ہٹا دیا۔ سوندھی سوندھی خوشبو چقندروں سے آ رہی
تھی۔ ایک چھری کا ٹوٹا ٹکڑا چقندروں پر رکھا ہوا تھا۔ پھیری والے نے ایک چقندر چنا
اور میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا: اچھا ہوگا اگر آپ خود ہی اس کا چھلکا اتار لیں
جناب.... گندے ہیں میرے ہاتھ.... ہم لوگ دیہاتی ہیں.... شہر نہیں دیکھا

ایک دن جمعرات کو جب کہ ہم لوگ اپنی مزدوری لیتے تھے میری بہن کو ایک آنہ زیادہ دیا۔ اور بولا تمہاری ماں بیمار ہے یہ اس کے لیے خرچ کرنا۔

پھر میری بہن کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔ میری بہن ہو کر ڈر گئی تھی کچھ نہ بولی اور ہم دونوں، جناب اپنی اماں کے پاس آئے۔ جس وقت سے کہ حاجی قلی نے میری بہن کو ایک آنہ زیادہ مزدوری دی، تو سوچنے لگی اور اماں تک گئی زیادہ روپیہ لیا۔

دوسرے دن سے میں نے دیکھا کہ راستہ اور بڑے لڑکے اپنے بیچ کھسر پھسر کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے کان میں ایسی باتیں کر رہے ہیں کہ معلوم پڑتا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ نہ سنیں۔

جناب، دوسری جمعرات کو بھی ہم بھائی بہن سب سے آخر میں مزدوری لینے گئے۔ حاجی نے خود ہی کہا تھا کہ جب اس کے پاس سے سب لوگ چلے جائیں تو ہم لوگ اس کے پاس جائیں۔ حاجی نے، جناب، بہن کو پانچ روپے زیادہ دیے اور بولا کہ میں تمہارے گھر آؤں گا، مجھے تمہاری اماں سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

بعد میں پھر میری بہن کے چہرے کو دیکھ کر ہنسا جو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ میری بہن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور اس نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔

مجھے معاف کریں گے جناب، آپ نے خود ہی کہا کہ میں سب کچھ بتا دوں۔ وہ زیادہ مزدوری میں نے حاجی کے سامنے پھینک دی اور بولا حاجی صاحب، ہمیں زیادہ روپے نہیں چاہئیں۔ میری اماں بڑا مانتی ہیں۔

حاجی پھر ہنسا اور بولا گدھے تو سمجھتا ہے پیارے، تمہارے لیے اور تمہاری اماں کے لیے نہیں ہے کہ تمہیں برا لگتا ہے یا بھلا۔

اس وقت وہ زیادہ روپیہ اٹھا لیا اور چاہا کہ میری بہن کے ہاتھوں میں رکھ دے کہ میری بہن پیچھے ہٹ گئی اور باہر دوڑ کر چلی گئی۔ مجھے غصے سے رونا آ رہا تھا، میز پر لکڑی رکھی ہوئی تھی، میں نے اٹھایا اور اس کو پھینکا۔ لکڑی نے اس کا چہرہ زخمی کر دیا اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ حاجی نے چیخ ماری اور مدد مدد پکارا۔ میں باہر بھاگا اور پھر نہیں جانتا کہ کیا ہوا۔ میں اپنے گھر آیا، میری بہن اماں کے گلے سے لگی ہوئی رو رہی تھی۔

رات میں، جناب، گاؤں کا چودھری آیا۔ حاجی قلی نے میری شکایت کی تھی اور یہ

مار ڈالوں۔ کاسہ گر ختم ہو گئے اور بچے میرے گھر سے لے گئے، میں غصہ سے رو رہا تھا اور میرے چہرہ سے خون بہہ رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا اور میرے چہرہ سے خون بہہ رہا تھا۔ . . . . آخر مجھے سکون ہو گیا۔

ہمارے پاس ایک بکری تھی۔ میں نے اور میری بہن نے بیس تومان میں خریدی تھی اسے ہم نے بیچ دیا اور تھوڑی پونجی جو ہم نے جمع کی تھی اس سے دو ایک پیسہ گزارا کیا۔ آخر میری بہن روٹی پکانے والی عورت کے ساتھ کام کرنے لگی اور بچے جو کام ملا کرنا شروع کر دیا۔ میں نے پوچھا پھیری والے تمہاری بہن شادی کیوں نہیں کرتی ہے؟

بتایا۔ نانبائی کا لڑکا اس کا منگیتر ہے میں اور میری بہن جہیز اکٹھا کر رہے ہیں تا کہ شادی کر دیں۔

اس سال گرمیوں میں میں تقریباً اسی گاؤں میں گیا تھا۔ پھیری والے کو جنگل میں چالیس پچاس بھیڑوں کے ساتھ دیکھا۔ میں نے پوچھا پھیری والے آخر تم نے اپنی بہن کا جہیز کس طرح تیار کر لیا۔

کہا: ہاں! شادی بھی کر دی . . . . اب میں اپنی شادی کے لیے پیسے جمع کر رہا ہوں۔ آخر جب سے میری بہن اپنے شوہر کے گھر یعنی سسرال گئی ہے میری ماں بالکل اکیلی رہ گئی۔ ایک شخص کی ضرورت ہے جو اس کا ہاتھ بٹائے اور دل بھی بہلائے۔ بے ادبی ہو گئی معاف کیجیے گا جناب۔

مخلص

محمد فرادی سکندر

# برف کے ڈلے کی کہانی

ایک دن برف باری کے وقت میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ برف کے ڈلے ناچتے، اڑتے، جھکتے اور پھسلتے ہوئے آ رہے تھے اور ہر چیز پر جم جاتے تھے۔ درختوں پر، دیواروں پر، صندوق پر، ہر چیز پر، تمام چیزوں پر۔ ایک بڑا ڈلا کھڑکی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھڑکی کی طرف نکالا اور ڈلے کو روک لیا۔ ڈلا بہت آرام سے ہاتھ میں آ گیا۔ کتنا سفید اور شفاف تھا، کتنا خوبصورت اور برابر کٹا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا: کاش برف کا ڈلا اپنی رام کہانی سناتا اور اپنی زبان سے سناتا!

اس وقت برف کا ڈلا بولا اور کہنے لگا: اگر یہ جاننا چاہتے ہو کہ میری سرگزشت کیا ہے۔ سنیے میں آپ کو بتاتا ہوں: میں چند مہینے پہلے پانی کا ایک قطرہ تھا۔ میں خزر کے سمندر میں تھا۔ میں سمندر کے لاکھوں کروڑوں قطروں کے ساتھ ادھر ادھر آتا جاتا تھا اور اپنی زندگی گزارتا تھا۔ ایک دن گرمیوں میں سمندر کی سطح پر پھر رہا تھا، سخت گرمی چمک رہی تھی، میں گرم ہو کر پھر بھاپ بن گیا۔ ہزاروں لاکھوں دوسرے قطرے میرے ساتھ بھاپ بن گئے۔ ہم ہلکے ہو کر پر والے بن گئے اور خود بخود اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔ ہوا ہمارے پیچھے پڑی تھی اور ہمیں چاروں طرف کھینچ رہی تھی۔ ہم اس قدر اونچے اٹھ گئے کہ پھر انسانوں کو نہ دیکھ سکے۔ چاروں طرف سے بھاپ کے پہاڑ آ رہے تھے اور ہم ان میں شامل ہو جاتے تھے کبھی ہم نیچی جاتے تھے اور بڑے تودوں میں جا کر مل جاتے تھے اور اوپر جاتے تھے اور دب جاتے تھے اور پھر

زیادہ بڑے ہو جاتے ، کبھی سورج کو چھپا لیتے ، کبھی چاند کا چہرہ ڈھانپ لیتے اور
کبھی تاروں کو ڈھک کر رات اور اندھیری بنا دیتے تھے ۔

جس طرح کہ بھاپ کے کچھ ذرے کہتے تھے ، ہم بادل بن گئے تھے ، ہوا ہمارے
اندر گھس آتی اور ہمیں عجیب اور طرح طرح کی شکلوں میں ڈھال دیتی ۔ میں جو
خود سمندر میں تھا کبھی کبھار بادلوں کو اونٹ اور آدمی اور گدھے کی تصویر میں
دیکھتا تھا ۔

مجھے معلوم نہیں کہ کتنے مہینے ہم آسمان میں مارے مارے پھرتے رہے ۔ موسم
ٹھنڈا ہو گیا تھا ہم اس قدر اندر چلے گئے تھے کہ ہم اپنے ہاتھ پیر بھی نہیں پھیلا سکتے تھے
ہم لوگ جھنڈ بنا کر چلتے تھے میں نہیں جانتا تھا ہم کہاں جا رہے ہیں ۔ میں اپنے آگے
پیچھے بھی نہیں دیکھتا تھا ۔ سورج کا کوئی پتہ نہ تھا گویا ہم لوگوں نے خود ہی سورج کا
سامنا روک لیا تھا ۔ ہم بہت پھیل گئے تھے ہماری لمبائی اور چوڑائی کئی سو کلو میٹر
پر پھیلی ہوئی تھی ۔ ہم چاہتے تھے کہ بارش بن جائیں اور زمین پر لوٹ آئیں ۔

زمین کے شوق میں میرا دل قابو میں نہیں تھا ۔ ایک زمانہ گزر گیا ۔ ہم سب آدھے
پانی اور آدھے بھاپ تھے ۔ ہم بارش بنتے جا رہے تھے ، اچانک موسم اتنا ٹھنڈا
ہو گیا کہ میں کانپ گیا اور ساتھ ہی سب کانپ گئے ۔ میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ
دوڑائی ۔ دوسرے ایک سے کہا ، کیا ہوا ؟ جواب دیا : اب زمین پاس ہی جہاں کہ ہم
ہیں ، جاڑا ہے ۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ دوسری جگہوں پر موسم گرم ہو ، یہ اچانک
سردی ہمیں اب بارش نہیں ہونے دے گی ۔ دیکھو ! میں برف ہوتا ہی جا رہا ہوں
تم خود بھی ۔ ۔ ۔

اس کا دوست اپنی بات کو جاری نہ رکھ سکا ۔ برف بن گیا اور زمین کی طرف چل
پڑا ۔ اس کے پیچھے ، میں اور ہزاروں ، لاکھوں دوسرے بھی ایک کے بعد دوسرے
برف بنتے گئے اور ہم زمین پر برس گئے ۔

جس وقت میں سمندر میں تھا ، بہت بھاری تھا لیکن اب ہلکا ہو گیا تھا ۔ گھاس
کے تنکے کی طرح اڑ رہا تھا ۔ میں ٹھنڈک کو بھی نہیں جانتا تھا ۔ اب ٹھنڈ میرے بدن
کا حصہ بن گئی تھی ۔ ہم ناچ رہے تھے اور نیچے آ رہے تھے ۔

جس وقت میں زمین کے نزدیک تھا، میں نے دیکھا کہ میں تبریز شہر کے پاس گرنے والا ہوں اور میں خزر کے سمندر سے کس قدر دور آگیا ہوں!

اس سے اوپر میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا ایک کتے کو لنگی مارنے ہی والا ہے اور کتا پوں پوں چلا رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اسی طرح سیدھا گروں گا تو اسے بچے کے سر پر گر پڑوں گا، تو میں نے ہوا سے خواہش کی کہ مجھے بچالے اور کسی اور جگہ لے جائے۔ ہوا نے میری درخواست مان لی، مجھے اٹھا کر یہاں لے آئی۔ جب دیکھا کہ تم نے اپنا ہاتھ میرے نیچے کیا ہے تو تم مجھے اچھے لگے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

* * *

ٹھیک اسی جگہ برف کے ذرے کی آواز کٹ گئی۔ میں نے نگاہ ڈالی، دیکھا کہ پانی ہو گیا ہے۔

ختم

۱۳ر فروری سنہ ۸۱ء

# بوڑھی عورت اور اس کا سنہری چوزہ

ایک بڑھیا تھی جس کا دنیا میں کوئی نہ تھا بس اس کا ایک سنہری چوزہ، اس چوزہ
کو بھی اس نے ایک دن کوڑے میں پایا تھا۔ بڑھیا ابٹن بناتی تھی اور مخمل خاتونوں کے
پاس لے جا کر بیچتی تھی۔ بڑھیا کا سنہری چوزہ بھی اس کی جھونپڑی اور آنگن میں چیونٹیوں
اور کیڑوں کے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ سنہری چوزہ کی موجودگی سے کوئی چیونٹا بڑھیا کی
جھونپڑی اور آنگن میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ تیز ملے اور بھ
وار تیز نے بھی سنہری چوزہ چیونٹیوں کو اچھالتا اور رہا کے بغیر ٹوٹ پڑتا اور بے تکلف
کھا جاتا تھا۔ بس اب وہ بلیاں کبھی کبھی آتیں جو ایک بوٹی گوشت کے لیے اس لگا اور اس
جگہ جھانکتی پھرتیں۔

بڑھیا کے آنگن میں اخروٹ کا ایک گھنا درخت بھی تھا جب اخروٹ کا موسم آتا
تو سنہری چوزہ کی بن آتی۔ جو اخروٹ گرتے چوزہ توڑتا اور کھاتا۔

ایک مکڑے نے بھی بڑھیا کے اکیلے پن سے فائدہ اٹھا کر چھت کے کونے میں خالی ڈبوں
کے پیچھے جالا تان کر جال پھیلایا تھا اور انڈے دیتا تھا۔ بڑھیا کسی زمانے میں ان ڈبوں میں
طرح طرح کے عرق اور جڑی بوٹیوں کا سرکہ بنا کر رکھتی اور انھیں بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔
اس کے رنگ برنگے ڈبے اب خالی پڑے تھے۔

مکڑے کا دل سنہری چوزہ کی موجودگی کی وجہ سے مطمئن نہ تھا۔ ہمیشہ سوچتا رہتا تھا کہ
آخر ایک روز اس کو سنہری چوزہ کا شکار بننا پڑے گا۔ خاص طور سے یوں بھی کہ کئی بار چوزے

سنہری چوزہ کو ننگا جیسے رنگا ہوا بہت پہلے اٹھ کر سورج نکلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔
سنہری چوزہ اخروٹ کے پیڑ کے نیچے آیا اور اس سے بولا: پیارے دوست ایک دو عدد
گرا دو تاکہ میرا ناشتہ ہو۔

اخروٹ نے اپنی ایک شاخ ہلائی، چند عدد پکے اخروٹ زمین پر گر پڑے۔
سنہری چوزے نے چاہا کہ اخروٹوں کی طرف دوڑ کر جائے لیکن ادھر بڑھیا کی آواز
سنائی دی۔ اے پیلے چوزے، انھیں ہاتھ نہ لگانا، تجھے حق نہیں کہ میرے اخروٹوں
کو توڑے اور کھائے۔

سنہری چوزے نے بڑھیا کی طرف تعجب سے دیکھا اور معلوم ہوا کہ گویا یہ کوئی اور بڑھیا
ہے: وہ خوش اور مہربان آنکھیں، وہ ہنستا اور چمکتا چہرہ اور وہ پھول اور میٹھا چہرہ اب نہ
پایا۔ کچھ نہ بولا: خاموش کھڑا رہ گیا۔ بڑھیا اس کے قریب آئی اور لات مار کر اسے دوسری
طرف دھکیل دیا۔ اخروٹوں کو اٹھا لیا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

سنہری چوزہ آخرکار بولا: ماں آج تو تم عجیب قسم کی ہو گئی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ
شیطان تمہارے سر میں داخل ہو گیا ہے۔

بڑھیا بولی: بھاگ جا! ... بہت ڈھیٹ ہو گیا ہے۔ ایک بار جب میں نے بتا
دیا کہ میرے اخروٹوں کو کھانے کا حق تجھے نہیں ہے میں انھیں بیچنا چاہتی ہوں۔

سنہری چوزے نے اپنا سر نیچے جھکا لیا اور جا کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ بوڑھی
عورت جھونپڑی میں چلی گئی۔ تھوڑا وقت گزرا، چوزہ چل پھر کر پیڑ کے پاس جا کر بولا:
اچھے دوست درخت، دو ایک اور گرا دے، دیکھوں اس بار کیا ہوتا ہے۔ آج تو میرا صبح
کا ناشتہ بالکل زہر ہو گیا۔

پیڑ نے اپنی ایک دوسری ڈال ہلائی اور چند عدد اخروٹ زمین پر گر گئے۔ چوزہ
تیزی سے دوڑا، انھیں توڑا اور کھا گیا۔ بڑھیا دوڑ پڑی اور چیخی۔ پیلے چوزے اب
میں تجھے بتاؤں گی کہ میرے اخروٹوں کو کھا جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

بڑھیا نے یہ کہا اور جا کر انگیٹھی جلائی پھر آ کر سنہری چوزے کو پکڑا اور انگیٹھی پر اس کی
دم انگاروں پر رکھ دی۔ سنہری چوزے کی دم جھلس گئی اور جل گئی۔ اخروٹ کا درخت زور
سے ہلا اور بڑھیا کے سر پر اور چہرے پر اخروٹ گرا گرا کے سخت زخمی کر دیا۔ بڑھیا نے

بڑھیا بولی: کیوں نہیں میرے نخرے بگھار، مہربان سنہری چوزے۔ اللہ علیم بچھیڑی میں چلیں۔

اس رات بڑھیا اور سنہری چوزے کے کھانے کے دسترخوان پر صرف آخروٹ کی گودی تھی۔ صبح جب بوڑھی عورت جاگی تو اٹھی اور جہاں کہیں بھی کونے کھدرے میں مکڑے کا جالا تھا اسے صاف کیا اور جھاڑ پونچھ کر باہر پھینک دیا۔

(ختم)

۱۵ر فروری [illegible]

# دو بلیاں دیوار پر

گرمیوں کی ایک رات تھی، چاند نہیں نکلا تھا، تارے بھی نہ تھے، فضا اندھیری تھی، آدھی رات کا وقت تھا، جھینگر بول رہے تھے اور کوئی دوسری آواز نہیں آرہی تھی۔ ایک کالی بلی دیوار کے دوسرے سرے سے چلی آرہی تھی، اپنا سر جھکائے ہوئے تھی، سونگھ رہی تھی اور دھیرے دھیرے چلی آرہی تھی۔

ایک سفید بلی بھی دیوار کے اس طرف سے آرہی تھی، اپنا سر جھکائے سونگھتی ہوئی ٹہلتی چلی آرہی تھی۔

دونوں آتی گئیں، آتی گئیں اور ٹھیک دیوار کے بیچوں بیچ دونوں کی کھوپڑی ایک دوسرے سے ٹکرا گئی۔ دونوں نے ایک بھوں... فو... کالی اور ایک بالشت پیچھے اچھل گئیں، پھر بیٹھ گئیں اور گھورنے لگیں۔ دونوں کا فاصلہ دو بالشت سے زیادہ نہ تھا، دونوں کا دل دھک دھک کر رہا تھا تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھی رہیں، کچھ نہ بولیں، غرغر کرتی رہیں اور دیکھتی رہیں آخر کار کالی بلی سامنے کھسکی، سفید بلی ذرا اٹھی اور تیزی سے بولی:

میاؤں... آگے نہ بڑھنا۔

کالی بلی نے موقع نہ دیا پھر اور آگے آئی، دھیرے دھیرے غرغر کر رہی تھیں ان کا فاصلہ ایک بتّے بھر رہ گیا تھا، کالی پھر بھی آگے چلی آرہی تھی سفید بلی نے بھی اب دیر نہیں کی، تیزی سے اپنا پنجہ کالی بلی کی طرف بڑھایا اور

مار کر اپنے کان کھڑے کر لیے پھر چیخی: میاؤں!... پھوں ، خو... خبردار میں نے کہا نہیں آگے مت آؤ...

کالی بلی بھی اپنی باری پر چلائی: پھوں ، خوں... خو!...

لیکن اپنی دشمن پر حملہ نہ کر سکی، بہت خفا ہوئی، تھوڑا پیچھے کھسکی اور تن کر بولی: میاؤں!... مجھے راستہ دے، میں جاؤں ورنہ جو کچھ ہوگا تیری وجہ سے ہوگا!

سفید بلی قہقہہ مار کر ہنسی، اپنی مونچھیں چاٹیں اور بولی: کیسی ہنسی کی باتیں کر رہی ہے تو! میں تجھے راستہ دوں کہ تو جا سکے! اگر راستہ خالی کرنا اچھا کام ہے تو خود راستہ کیوں نہیں دیتی ہے کہ میں دریوار کے اس پار چلی جاؤں۔

کالی بلی نے کہا: میں نے کہا مجھے جانے کا راستہ دے، پھر تو آ اور جہاں جانا چاہتی ہے وہاں جا کر دفن ہو جا۔

سفید بلی اور زیادہ زور سے ہنسی اور بولی: اس بار اگر میری بات نہیں سنتی ہے تو ایک لقمہ بنا کر رکھ دوں گی۔

کالی بلی سخت بھڑک اٹھی اور ایک چیخی: میاؤ... ں ں ، لوٹ جا اور چھت پر چلی جا، راستہ دے میں جاؤں ، مری چھوپیا!

سفید بلی کی رگ حیرت پھڑک اٹھی، اس کی ہنسی کا قہقہہ بول اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ایک چیخ حلق کے اندر سے نکالی: میاؤں ں ں ں ں، کیا کہا چھوپیا؟... بیوقوف، پھوں!... خوں!... ے... خوں پھوں پھوں! اور پنجہ کالی بلی پر چلایا اس بار کالی نے وار خالی دیا اور اس کی ناک پر پنجہ مار کر لہولہان کر دیا، خون بہنے لگا، اب تو سفید بلی کا راستہ روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اپنی پیٹھ جھکائی اور اس کے رونگیں کھڑے ہو گئے اتنا شور اور ہنگامہ ہوا کہ جھینگروں نے چہچہا بند کر دیا اور چوہے سہم گئے گلاب کا ایک پھول کھلنا ہی چاہتا تھا کہ ادھ موا رہ گیا، ایک زبردست ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر نیچے آرہا۔

سفید بلی نے زیادہ غصہ میں کہا: میاؤں... کیا تو نے سنا نہیں کہ میں

نے کہا: لوٹ جا، مجھے جانے کا راستہ دے۔ کالی مرگھلی چپ رہا۔

اب کالی بلی کے چپنے کا موقع تھا۔ ہنس کر بولی: پہلی بات تو یہ کہ چوہے زیادہ سفید ہوتے ہیں یا کالے؟ بس تو خود چپ رہا ہے۔ دوسری بات کہ زیادہ شور و غل نہ مچا کہ لوگ جاگ جائیں اور آکر ہم دونوں کو ڈنڈے ماریں میں خود چیخنے اور چلانے سے نہیں ڈرتی ہوں اور لوشنا بھی نہیں جانتی ہوں اسی جگہ بیٹھی رہوں گی جب تک تیری ہمت نہ چھوٹ جائے اور اپنے کام پر نہ چلی جائے۔ سفید بلی نے تھوڑی دیر تک سوچا اور بولی: میں اور تیری ہمت چھوٹ جائے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کاش ظہر کے وقت تو حسن نامنبائی کے ہوٹل ہوتی اور دیکھتی کہ کس طرح پورے تین گھنٹے تک میں نے پلک نہیں جھپکائی اور چوہے کی بل کے سرے پر بیٹھی رہی۔

کالی بلی اب کچھ نہ بولی۔ مطمئن بیٹھی گھورتی رہی۔ سفید بلی بھی بیٹھ گئی اور اس نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی پھر بچہ چپ ہو گیا۔ دو منٹ تک بلیاں اپنی آنکھیں بند کیے جھکی رہیں اور ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہ ہٹی۔ پھر جھینگروں کی چیر چیر سنائی دی اور گلاب کا پھول شاید کھلنا چاہتا تھا۔ اب معلوم ہو رہا تھا کہ اب بلیوں کا صبر ختم ہو چکا ہے۔ ہر ایک چاہتی تھی کہ دوسری بولنا شروع کرے۔

اچانک سفید بلی بولی: میں نے اس کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔

کالی بلی بولی: کیا حل؟

سفید بولی: مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے، بہت بہت ضروری تو لوٹ کر دیوار کے آخر تک جا، میں اگر چلی جاؤں پھر تو چلی جانا۔

کالی بلی کو ہنسی آ گئی اور بولی: تو نے عجیب حل تلاش کیا! مجھے خود بہت ضروری کام ہے، بہت اہم اور فوری۔ میں تو آدھا منٹ بھی دیر نہیں کر سکتی۔

سفید بلی منہ بنا کر بولی: کیا تو بعد میں نہیں جا سکتی! میں نے کہا نہ

کہ مجھے ضروری کام کرنا ہے، مان لے اور میرے راستے سے ہٹ جا!...
کالی بلی اور زور سے بولی: میاؤں... مگر تم کون ہو جو مجھے حکم دے رہی ہو، اپنی زبان سنبھال کر بات کر۔
سفید بلی غرائی، چلا کر چلائی: میاؤں وؤں۔ میں اپنی بات کہہ چکی ہوں تو البتہ ضدی بلی ہے، میں حسن نانبائی کے گھر جانا چاہتی ہوں، مجھے دال سری پائے پکنے کی مہک آ رہی ہے۔ اب بھی نہیں سمجھی کہ مجھے کتنا ضروری کام ہے۔
کالی بلی بھی گھٹی ہوئی آواز میں بولی: میاؤں وؤں، تم سوچتی ہو کہ میں لوگوں کی دیوار پر یونہی بے کار پھر رہی ہوں، میں نے بھی اس طرف سبزی قورمہ پکنے کی اشتہا انگیز مہک سونگھی ہے اور میں بھوکی بھی بہت ہوں۔ اگر تو پھر بھی میرے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے، ایسا ماروں گی کہ نیچے گرے گی اور تیرا بھیجا پھٹ جائے گا۔
سفید بلی اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی اس لیے چیخی: میاؤں پاگل ہٹ جا کنارے، پچھوں، توں!...
اور اچانک کالی بلی کے بالوں میں اپنے پنجوں کے ناخن گاڑ دیے بہت سے بال ہوا میں بکھر گئے۔ پھر دونوں نے پچھون فون شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر ایک دوسرے کو پٹکنے، کاٹنے اور نوچنے لگیں۔
بلیاں لڑائی میں مشغول تھیں کہ کسی نے ان کے اوپر دیوار کے پار سے سرد پانی پھینکا، دونوں الگ الگ ہو گئیں، تیزی سے اپنے اپنے راستے پر لوٹ گئیں اور بھاگ گئیں۔
ہر ایک جس راستے سے آئی تھی اس پر بھاگی اور مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔

# دو مرول دیوانہ کی کہانی

کسی زمانہ میں اوغوز قبیلہ میں دومرول دیوانہ نام کا ایک پہلوان تھا۔ اسے دیوانہ اس لیے کہتے تھے کہ بچپن میں تو جنگلی سانڈ مار ڈالے تھے اور دوسرے بڑے کام بھی کیے تھے۔ ابھی جلد ہی ایک سوکھے دریا پر ایک پل بنایا تھا اور سارے گزرنے والوں اور راستہ چلنے والوں کو مجبور کرتا تھا کہ اس کے پل پر سے گزریں۔ جو کوئی پل پار کرتا اس سے پیسہ وصول کرتا اور جو بچنا چاہتا یا دوسرے راہ نکل جانا چاہتا تو خوب ڈنڈے کھاتا اور پھر جرمانہ ادا کرتا اور گزرتا۔

تم پاگل نہیں پوچھتے ہو کہ دومرول کیوں ایسا کرتا تھا؟

وہ خود ہی کہتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کوئی طاقتور پہلوان پیدا ہو اور مجھ سے ٹکر کر زمانے اور میرے ساتھ جنگ کرے تا کہ اسے زمین پر دے ماروں اور میری پہلوانی کی شہرت ساری دنیا والوں کی زبان پر بیان ہو۔

دومرول ایسا ہی بہادر تھا۔

ایک دن ایک قافلہ آیا اور پل کے کنارے خیمہ گاڑ دیا۔ ان لوگوں میں ایک جوان تھا جو اپنی نیکی اور پہلوانی کے لیے مشہور تھا۔ اچانک ایک روز بیمار پڑا اور مر گیا۔ رونے دھونے کی آواز آسمان پر پہنچی۔ کوئی کہتا تھا ہائے بیٹے اور اپنا بال نوچتا دوسرا کہتا تھا ہائے بھائی اور اپنے سر پر مٹی ڈالتا تھا۔ سب رو رہے تھے اور ماتم کر رہے تھے اور اس پہلوان کا نام زبان پر لاتے تھے۔

اچانک دومرول پہلوان شاہ سے دونے پیٹنے کی آواز سنی غصہ ہوا اور چیخا اور پوچھا تو
کیوں رو رہے ہو ؟ کیا ہوا تو بتایا غلط ہے جو تم لوگ میرے پل کے کندھے لائے ہو۔
قافلے کے بڑے بوڑھے سامنے آئے اور بولے پہلوان غصہ نہ ہو ہمارے ساتھ ایک بہادر
پہلوان تھا جو آج ہی مر گیا ہمارے بیچ سے رخصت ہو گیا۔ اس کی یاد میں ہم رو رہے ہیں۔
دومرول دیوانہ نے اپنی تلوار کھینچ لی اور چلایا ہائے کس نے اسے قتل کیا۔ کیسے ہمت
ہوئی کہ میرے پل کے پاس آدمی کو مار ڈالے
بزرگوں نے بتایا کسی نے اسے نہیں مارا اللہ تعالیٰ نے عزرائیل کو حکم دیا اور عزرائیل جن
کے لال رنگ کے پر ہیں اچانک آیا اور اس پہلوان کی جان لے لی۔
دومرول دیوانہ نے غصے سے بھری آواز میں کہا، عزرائیل کون ہے ؟ میں عزرائیل
عزرائیل کو نہیں جانتا ہوں۔ اے خدا میں تیری قسم کھاتا ہوں عزرائیل کو میرے پاس
بھیج اور میری آنکھوں کے سامنے آنے دے تاکہ اس کے ساتھ لڑائی کروں اور اپنی بہادری
کا مظاہرہ کروں اور بہادر نوجوان کی زندگی اس سے دوبارہ لوں تاکہ جب تک عزرائیل
رہے پھر کسی آدمی کو بزدل کے ساتھ نہ مارے اور بہادروں کی جان نہ لے۔ دومرول یہ کہہ
کر اپنے گھر چلا گیا۔
اللہ میاں کو دومرول کی بات پسند نہیں آئی۔ عزرائیل سے فرمایا اے عزرائیل
تم نے دیکھا کہ اس پاگل نے کیا غرور آمیز باتیں کہیں، وہ میری طاقت اور یکتائی کا شکریہ ادا
نہیں کرتا ہے اور میرے کاموں میں دخل اندازی کرتا جاتا ہے اور یہ کہ اپنے آپ پر
گھمنڈ کرتا ہے
عزرائیل بولے۔ اے خداوند بزرگ! مجھے حکم دے میں جاکر اس کی جان لوں تاکہ اس
کی عقل میں آ جائے اور جانے کہ موت کیا چیز ہوتی ہے ؟
اللہ میاں بولے۔ اے عزرائیل ابھی غائب ہو جاؤ اور اس دیوانہ کی آنکھوں میں نظر
آؤ۔ اسے ڈراؤ۔ اس کی جان نکال لو اور میرے پاس لے آؤ۔
عزرائیل نے جواب دیا میں ابھی دومرول کے پاس جاتا ہوں اور اس پر ایسی نظر ڈالتا
ہوں کہ مجھے دیکھ کر بید کی طرح کانپنے لگے اور اس کا رنگ زعفران کی طرح ہو جائے۔
دومرول دیوانہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے چنے ہوئے چالیس پہلوانوں کے

ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اپنی پہلوانی، بہادری اور چیتے اور شیر کے شکار کی باتیں کر رہے تھے۔ دروازے پر چوکیدار پہرہ دے رہے تھے اچانک عزرائیل دومرول کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوئے۔ پہرہ داروں اور چوکیداروں میں سے کسی نے اس کو نہ دیکھا تھا۔ ایک بڑھا سا ڈراونی صورت والا جسے جنگل کا شیر بھی دیکھ کر پتہ پانی پانی کرے۔ اپنی لال لال آنکھوں کے ساتھ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔

جیسے ہی دومرول نے سامنے دیکھا۔ دنیا اس کی نگاہوں میں اندھیری ہو گئی اس کا طاقتور ہاتھ کانپنے لگا اور زبان اس کے لیے مشکل معلوم ہونے لگا۔ چلایا اب دیکھو اس نے کیا کہا! کہا اے ڈراونے بڈھے تو کون ہے جسے میرے دربانوں نے نہیں دیکھا۔ میرے پہرہ داروں کی نگاہیں نہیں پڑیں۔ میری آنکھوں کو اندھا کر دیا اور میرے مضبوط ہاتھوں کو لرزا دیا۔ او سفید داڑھی والے بڈھے بتا میں دیکھوں تو کون ہے کہ میرے بدن میں کپکپی دوڑا دی اور میرے جگر کا پیالہ زمین پر الٹ دیا ہو گئے۔ آدھے چند مرے بڈھے بتا تیرا یہاں کیا کام ہے؟ ورنہ اٹھتا ہوں اور اتنی پریشانیاں اور مصیبتیں تیرے سر پر نازل کروں گا کہ جب تک دنیا باقی رہے گی۔ اس کا قصہ سنایا جاتا رہے گا۔

دومرول دیوانہ سا پریشان تھا کہ اپنی مونچھیں چبا رہا تھا اور غصہ میں اپنی شمشیر کے دستے پر ہاتھ رکھا تھا دوسرے پہلوان خاموش بیٹھے تھے اور یقین کر رہے تھے کہ بڈھا آدمی دومرول کے ہاتھوں سے زندہ بچ کر نہ جا سکے گا۔

جس وقت دومرول کی بات ختم ہوئی عزرائیل قہقہہ مار کر ہنسے اور کہا اے بد معاش دیوانے! میری سفید داڑھی تمہیں اچھی نہیں لگی! اچھا! تم یہ جان لو کہ بہت سے کالے بالوں والے پہلوان تم سے پہلے بھی گزر چکے ہیں جن کی جان میں نکال چکا ہوں اور میری اندھی اور چندھیائی ہوئی آنکھیں بھی تمہیں پسند نہیں آئیں! اچھا! یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سی ہرن جیسی خوبصورت آنکھیں رکھنے والی دلہنیں اور لڑکیاں بھی ہیں جن کی روح میں قبض کر چکا ہوں اور ان کے شوہروں اور ماؤں کو ماتم بپا کرنے پر بٹھا دیا ہے۔

کسی کو بھی کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ دومرول کا منہ جھاگ سے بھر گیا تھا۔ چاہتا تھا جتنی جلد ہو سکے تو دو کو بڈھے آدمی کو پہنچوا دے تاکہ اٹھے اور تلوار کے ایک ہی وار سے منہ دو ٹکڑے کر دے۔ چلایا اور بولا۔ اے بڈھے! اپنا نام بتا میں دیکھوں کہ تو کون ہے

ورنہ میں تجھے قتل کر کے بے نام ونشان کر دوں گا۔ . . . اب مجھے اور صبر کرنے کی تاب نہیں ہے ۔

عزرائیل نے کہا: اب تو سمجھ گیا میں کون ہوں ۔ اے بدمعاش دیوانے تجھے یاد ہے کہ تو اپنے اوپر گھمنڈ کرتا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر پروں والے عزرائیل کو دیکھ پاؤں تو میں اسے مار ڈالوں گا اور لوگوں کو نجات دلاؤں گا ۔

دومرول بولا: میں پھر بھی کہتا ہوں کہ اگر عزرائیل میرے ہاتھ آجائے تو میں اس کے پر نوچ ڈالوں گا اور اس کا بھیجا پاش پاش کر دوں گا ۔

عزرائیل بولے: اے پاگل گھمنڈی اب آیا ہوں کہ تیری جان نکالوں ۔ . . . جان دیتا ہے یا میرے ساتھ مارپیٹ کرے گا ؟

دومرول دیوانہ نے جیسے ہی یہ سنا اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور چیخ ماری اور بولا تم رنگ برنگے پروں والے عزرائیل تمھیں ہو ؟

عزرائیل نے کہا: ہاں میں ہی ہوں ۔

دومرول بولا: بس تمھارے بال کہاں ہیں بدبخت ؟

عزرائیل نے جواب دیا: میری ہزار صورتیں ہیں ۔

دومرول بولا: ان پہلوانوں، دلہنوں کی جان تم لیتے ہو، بزدل ؟

عزرائیل بولے: تم نے ٹھیک کہا ہے ۔اب تمھاری باری ہے ۔

دومرول نے فریاد کی: میں تو تمھیں آسمان میں ڈھونڈ رہا تھا بے رحم بڑھیا، تم ہی میرے پیچھے یہاں آگئے ۔اب میں تمھیں بتاؤں گا کہ کس طرح جان لیتے ہیں ۔

دومرول نے یہ کہا اور پہرہ داروں اور چوکیداروں کو حکم دیا ۔ چوکیدارو ، دروازہ بند کر دو ، اچھی طرح سے ہوشیار رہنا کہ یہ بھاگ نہ پائے ۔

پھر اپنی تلوار سونت لی اٹھائی اور عزرائیل پر حملہ کر دیا ۔عزرائیل کبوتر بن گئے اور ایک چھوٹے سوراخ سے اڑے اور غائب ہو گئے ۔ دومرول نے تالی بجائی اور مسکرا کر ہنسا اور اپنے پہلوانوں سے بولا: تم لوگوں نے دیکھا کہ عزرائیل میری تلوار کی مار سے ڈر کر بھاگ گیا ؟ ایسا ڈر کر کہ دروازہ چھوڑ کر چوہے کی طرح سوراخ سے غائب ہو گیا ۔ لیکن میں اس کی جان نہیں بخشوں گا۔ اٹھ کھڑے ہو میرے بہادرو :

ہم دس کا پیچھا کر رہے گے اور میں قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میں اسے اپنے شاہین سے
شکار نہ کر لوں اس وقت تک اس کو آرام سے نہ رہنے دوں گا ۔

اکتالیس پہلوان کھڑے ہو گئے اور گھوڑے پر سوار ہوئے اور نکل پڑے۔ دومرول
روانہ اپنے بازو پر اپنا شکاری شاہین لیے ہوئے تھا اور عزرائیل کے پیچھے گھوڑا دوڑا
رہا تھا۔ جہاں کہیں کوئی کبوتر دیکھا شکار کر لیا لیکن عزرائیل کو نہ پا سکا۔ لوٹتے وقت
اکیلا رہ گیا۔ اسے راستے کا راستہ چل رہا تھا کہ شاید عزرائیل کو پکڑ لے۔ ایک گڑھے کے
کنارے پہنچا۔ اچانک عزرائیل دومرول کے گھوڑے کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوئے
گھوڑا بدکا، گھوڑا چلا جا رہا تھا کہ اچانک بھڑک کر دومرول کو اچھال دیا اور گڑھے میں
گرا دیا۔ دومرول کا کالا بالوں والا سر جھکا کا جھکا رہ گیا۔ عزرائیل فوراً گڑھے میں
اترے اور اپنا پیر دومرول کے سفید سینے پر رکھا اور پھر بیٹھ کر کہا، او دومرول دیوانے
اب کیا کہتا ہے؟ اب تو میں تیری جان نکالنا ہی چاہتا ہوں۔ اب کیوں لڑائی نہیں
لڑتا اور اپنی پہلوانی نہیں دکھاتا؟

دومرول تھر تھر کر رہا تھا بولا، اے عزرائیل میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا
میں نہیں جانتا تھا کہ ڈاکہ ڈال کر جان لو گے اور پیچھے سے خنجر مار دو گے ۔ ۔ ۔ آہ ۔ ۔ !

عزرائیل نے کہا: بکواس نہ کرو، اگر کوئی مناسب بات کہنا چاہتا ہے تو کرو۔
یاد رہے کہ تو اپنی آخری سانس لے رہا ہے۔

بہادر، طاقتور اور زبردست پہلوان دومرول ایک ایسے کمزور شخص کا شکار
ہوا تھا جس کی ہزار شکلیں تھیں اور ڈاکہ ڈال کر جان لیتا ہے اور پیٹھ پیچھے خنجر
مارتا تھا۔ وہ آزاد پہلوان دومرول اب پریشان حال تھا اور اس کا دل سینے میں
تنگ ہوا جا رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ مر جائے۔ چاہتا تھا موت نہ ہو اور زندگی
باقی رہے اور خوشیوں سے بھرپور زندگی ہو اور خوشی سب کے لیے ہو اور وہ دوسروں
کے لیے خوشی فراہم کرے جس طرح اس سے قبل اپنے قبیلہ والوں کے لیے سخت
محنت کی تھی اور اپنی سرزمین میں خوشی اور خوشحالی لایا تھا۔

آخر بولا: عزرائیل ایک لمحہ کا موقع دو، میں تو دیکھ رہا ہوں، ہماری
سرزمین میں بڑے اور بھاری پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

اور ایسی اونچی جگہ پر ہے جیسا پہلوان تیر پھینکے تو وہاں کی نوک کو بھی نہ پہنچ سکے ۔ انہیں پہاڑوں کے دامن میں ہم باغوں سے بھرے ہوئے علاقے کے مالک ہیں ۔ اور ان باغوں میں انگور کے درخت کثرت سے ہیں اور بہت کثرت سے سیاہ انگور پھیلے ہیں جیسے میٹھے اور لذت دار اور ایسے صاف ستھرے منقے ۔ ہم انگوروں کو نچوڑتے ہیں اور مشکول میں ان کے عرق بھر دیتے ہیں اور انتظار میں رہتے ہیں کہ عرق سڑ کر بن جائے، اس وقت ہم وہ شراب پیتے ہیں اور مست ہو جاتے ہیں اور بیہوش ہو جاتے ہیں اور بے قابو ہو جاتے ہیں اور ایسا نعرہ لگاتے ہیں کہ جنگل کا شیر بھی مارے خوف کے کانپنے لگتا ہے اور اس کے بدن کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ میں نے بھی وہ شراب پی اور مست ہو گیا اور نہیں جانتا کہ اللہ میاں کو یہ بات پسند نہیں آئی ۔ ورنہ پہلوانی نے مجھے مست نہیں کیا ۔ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں ابھی نہیں چاہتا اللہ مجھے عزت بڑی لگتی ہے اور میں مرنا نہیں چاہتا ہوں تا ابھی کچھ اور جیوں، کچھ اور مہربانیاں کروں، اچھائیاں کروں ۔ آہ ۔ ۔ ۔ عزرائیل ۔ ۔ ۔ تیری پناہ، نہ نکال مجھے اپنے حال پر چھوڑ دے اور جا کر ان کی روحیں قبض کر جو بڑے ہیں اور برائی کرتے ہیں اور اپنی خوش قسمتی دوسروں کی مجبوری میں تلاش کرتے ہیں اور اپنی روٹی دوسروں کو بھوکا رکھ کر حاصل کرتے ہیں ۔
جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ !

عزرائیل بولے : بدبخت بکواس کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ تیری عاجزی اور خواہش سے بھی کفر کی جھلک آ رہی ہے اور پھر یہ بھی کہ اپنی درخواست مجھ سے نہ کر میں تو خود ہی مجبور مخلوق ہوں اور کوئی کام مجھ سے نہیں بنتا بگڑتا ہے ۔ میں تو صرف فرمان خداوندی پر عمل کرتا ہوں ۔

مردول نے کہا : پس بہادروں کی جان اللہ میاں لیتے ہیں ؟

عزرائیل بولے : صحیح ہے، مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

مردول بولا : پس تم کون سی بلا ہو جو بے وقت خلل اندازی کرتے ہو، میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ تاکہ میں اپنا کام خود کر لوں ۔

عزرائیل مردول کے سینے پر سے اٹھ گئے لیکن اسی طرح اپنا پیر اس کے سفید سینے پر دبائے رہے اور پہلوان مردول کا سانس گھٹتا جا رہا تھا اور عزرائیل کا پیر

اس کے دل کی دھڑکن محسوس کر رہا تھا اور اس کی گرمی کا اندازہ کر رہا تھا۔
دومرول دیوانے نے اپنا ہاتھ آگے پھیلایا اور اپنی پیشانی کا خون صاف کیا اور کہا: اے خدا! میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے، کیا ہے اور کہاں ہے، بہت سے نادان تیرے آسمان میں چکر لگاتے ہیں، تیری زمین میں تجھے تلاش کر رہے ہیں لیکن کچھ نہیں جانتے ہیں کہ تو خود دانا لوگوں کے دل میں موجود ہے۔ اے خدا اگر میری جان تو لے بھی لے تو خود تو لے، اس بزدل عزرائیل کے ذمہ مت کر۔
عزرائیل بولے: بدقسمت بےچارہ، تیری نالائی اور دعا سے بھی کفر کی بو آ رہی ہے۔ لیکن مجھ سے کامیابی نہ پائے گا!...
اللہ میاں کو دومرول کی باتیں اچھی لگیں اور عزرائیل کو حکم دیا: اے عزرائیل یہ کام تجھ سے متعلق نہیں، کہہ دے کہ دومرول ایک دوسری جاندار چیز تلاش کرے، اور مجھے دے اور تو اب اس کی روح قبض نہ کر۔
عزرائیل بولے: اے خداوند جہاں، اس بدزبان کو اس جگہ چھوڑ دینا اچھا نہیں ہے۔
اللہ میاں نے فرمایا: عزرائیل اس وقت تم میرے کاموں میں دخل نہ دو۔
عزرائیل نے اپنا پیر دومرول کے سینہ پر سے اٹھایا اور بولے اٹھ جا، اگر کوئی جاندار چیز حاصل کرے جو تیری جان کا بدلہ ہو تو میرا تجھ سے کوئی مطلب نہیں رہے گا۔

دومرول پہلوان نے اپنے آپ کو ہلایا اور کھڑا ہو کر اپنے ٹوٹے ہوئے پیر کو دیکھا اور بولا: دیکھا عزرائیل میں کس طرح تمہارے قابو سے نکل آیا، آؤ ہم اپنے بوڑھے باپ کے پاس چلیں، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اپنی جان دینے میں تکلف نہیں کرے گا۔

دومرول دیوانہ آگے چل پڑا اور عزرائیل اس کے پیچھے، وہ دونوں دومرول کے باپ کے پاس آئے۔ اس کے باپ کا نام "دوخا قوجا" تھا جب دومرول کا سر اور چہرہ خون آلود دیکھا، چلانے لگا اور بولا: بیٹا، یہ کیا حال ہے؟ تیرا گھوڑا کہاں رہ گیا؟ یہ کون ہے جو میرے اوپر بری نظریں ڈال رہا ہے۔

دومرول جھکا اور اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ چوما اور کہا: باپ، دیکھو۔ میرے سر پر کون سی آفت آئی ہے۔ میں نے کفر بکا اور اللہ میاں کو یہ بات اچھی نہیں لگی عزرائیل کو حکم دیا کہ بلند آسمان سے اُترے اور میری جان نکال لے۔ عزرائیل نے میرے سفید سینہ پر اپنا پیر رکھ دیا اور مجھے خرخرا دیا اور چاہا کہ میری جان لے لے۔ اب آبا جان اپنی جان عزرائیل کے حوالے کر دیں گے کہ دومرول کو چھوڑ دے یا پھر میرے ماتم میں سیاہ کپڑے پہنیں گے اور ہائے بیٹے! ہائے . . . کہیں گے۔ کون سی چیز پسند کریں گے آبا جان، جلدی بتائیے کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔

بوڑھا تو جا چپ ہو گیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ دومرول کے چالیس پہلوان شکار سے لوٹ کر دومرول کے بھاگتے ہوئے گھوڑے کو دیکھ چکے تھے کہ وہ بالکل اکیلا آ گیا اور دومرول کو نہیں لایا۔ سب دومرول کا انتظار کر رہے تھے اور اب دیکھ رہے تھے کہ پہلوان زخمی اپنے باپ کے سامنے کھڑا ہے

آخر اس کا باپ بولا اور کہا: اے دومرول! اے دل کے ٹکڑے! اے بیٹے! اے پہلوان کہ اپنے بچپن میں تو عدد ساٹھ مار ڈالے، تو میری زندگی کا عصا اور میرے گھر کا کھمبا ہے، تو میری خوبصورت لڑکیوں اور دلہنوں کا کھلا ہوا پھول ہے، میں تجھے مرنے نہیں دوں گا۔ یہ کالے اونچے پہاڑ جو تیرے سامنے کھڑے ہوئے ہیں، میری ملکیت ہیں اگر عزرائیل چاہتا ہے تو یہ اس کو مل جائے گا۔ میرے پاس بہت ہی سرد میٹھے پانی کے چشمے ہیں، میرے پاس لمبی گردنوں والے گھوڑے بھی ہیں صف در صف اونٹ ہیں، میرے پاس طویلے اور باڑے ہیں جن میں بھیڑیں اور بکریاں بندھی ہیں۔ اگر عزرائیل کو ضرورت ہے سارا سامان اسی کا ہے، جتنا سونا چاندی چاہتا ہے میں دوں گا۔ لیکن بیٹا زندگی مٹھاس ہے اور جان بڑی پیاری چیز ہے، میں ان چیزوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہوں۔

دومرول بولا: آبا! ساری چیزیں آپ کی ہیں اور رہیں گی، میں تو تمہاری جان چاہتا ہوں دے سکتے ہو یا نہیں؟

بوڑھا تو جا نے کہا: بیٹا! مجھ سے زیادہ دوست اور عزیز تر اپنی "آ" کو رکھتا ہے جا اس کے پاس جا۔

عزرائیل آمادہ ہوگئے تھے کہ دومرول کی روح قبض کریں کہ دومرول بولا:
اماں ذرا ٹھہر جاؤ عزرائیل! . . . اب اپنی اماں کے پاس چلیں گے۔

پھر دومرول کی اماں کے پاس گئے۔ دومرول نے اپنی اماں کا ہاتھ چوما اور کہا:
اماں پوچھتی نہیں ہو کہ میں کیوں زخمی ہو گیا ہوں، کیوں میرے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے ہیں
اور کون سی بلا میرے اوپر آن پڑی ہے؟

اس کی اماں روتی ہوئی بولی: ہائے میرے بیٹے تیرے اوپر کون سی آفت آئی ہے؟
دومرول بولا: اماں، لال بالوں والے عزرائیل اڑتے آسمانوں سے اتر کر نیچے
آئے اور میرے سینے پر سوار ہو گئے، میری سانس گھٹ کر نکلنے لگی، اور میری جان لینا چاہا
اپنے باپ سے اس کی جان مانگی تاکہ عزرائیل مجھے چھوڑ دے لیکن باپ نے جان نہیں دی
اب میں تجھ سے چاہتا ہوں، اماں جان، اپنی جان مجھے بخش دو یا پھر کالے کپڑے پہن
کر ہائے میرا بیٹا . . . کہو گی۔ اماں کیا کہتی ہو؟

اس کی والدہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر سر اٹھا کر بولی: بیٹا، اے بیٹا! اے میری
آنکھوں کے نور، اے جگر کے ٹکڑے جو نو مہینے میرے پیٹ میں رہا۔ اسے جس نے میرا سفید دودھ
پیا کاش تو اونچے قلعوں اور ہاتھ نہ پہنچنے والے گنبدوں میں قید کر دیا جاتا۔ میں
آتی، سونا چاندی پانی کی طرح بہا دیتی اور تجھے چھڑا لیتی۔ لیکن کیا کروں کہ تو بڑی
جگہ پھنس گیا ہے اور میں وہاں نہیں آسکتی ہوں۔ بیٹے، زندگی بڑی میٹھی ہے اور
جان بہت پیاری چیز ہے، میں اپنی جان کو قربان نہیں کر سکتی ہوں۔ میرے پاس
کوئی علاج نہیں ہے! . . .

دومرول کی اماں نے بھی اپنی جان نہیں دی، دومرول پریشان ہو گیا، عزرائیل
پھر اس کی جان لینا چاہتے تھے کہ دومرول بگڑ گیا اور چیخا، اپنا ہاتھ روک لو بزدل،
ایک لمحہ کا موقع اور دو بے مروت! . . .

عزرائیل طنز پر ہنستے ہوئے بولے: جا درباب اور کیا چاہتے ہو؟ تم نے دیکھا کہ
کسی آدمی نے تم پر رحم نہیں کیا اور اپنی جان نہیں دیا، جتنی جلد جان دے دو خود
تمہاری بھلائی اور فائدہ ہے۔

دومرول نے کہا: چاہتے ہو کہ حسرت میرے دل میں باقی رہ جائے۔

عزرائیل نے پوچھا۔ عورت کون ہے؟

دومرول نے کہا: میری بیوی ہے، دو بچے ہیں، امانت ہیں، چلوں ان کو اپنی بیوی کے حوالے کردوں۔ اس وقت جو کچھ کرنا چاہتے ہو میرے ساتھ کرلینا۔

دومرول چل پڑا اور اپنی بیوی کے پاس گیا، دومرول کی بیوی بیٹھی ہوئی اپنے دونوں بچوں کو دونوں گھٹنوں پر سلائے دودھ پلا رہی تھی اور پیار سے سہلا رہی تھی اور بچے چہل کرتے ہوئے اپنی ماں کے سینہ سے دودھ پی رہے تھے اور ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

دومرول آیا، اپنی بیوی کو دیکھا، بیٹوں کی طرف نگاہ دوڑائی اور اس کا دل آرزو اور خوشی سے بھر گیا جب اس کی بیوی نے اسے دیکھا تو اپنے بیٹوں کو زمین پر سلا دیا اور فریاد کرتی ہوئی دومرول کی گردن سے لپٹ گئی اور بولی، اے دومرول، اے میرے محافظ پہلوان! یہ کیا حال ہے؟ تو تو کبھی غم کا نام بھی نہیں جانتا تھا، تجھے تو کبھی اداسی بھی نہیں ہے، کیوں اس وقت اتنا پریشان اور غمگین ہے؟..... اپنے بیٹوں کو دیکھ.....

دومرول نے اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھا، بکری کی کھال پر قلا بازیاں کھیل رہے تھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ اور پیر پکڑ کر کھینچتے تھے اور کھیل رہے تھے اور آوازیں لگا رہے تھے اور ان کی آنکھیں خوشی کی زیادتی سے چمک رہی تھیں۔

دومرول نے ایک لمحہ ان کا تماشا دیکھا۔ پھر اپنی بیوی سے کہا: اے میری زندگی کی ساتھی، اے میری عزیز بیوی اور اے میرے بچوں کی ماں! سن کہ آج عزرائیل سرخ بال آسمان کی بلندی سے اتر کر آیا اور انتہائی بزدلی کے ساتھ میرے سینے پر سوار ہو گیا اور میری جان عزیز نکال لینا چاہا۔ میں اپنے بوڑھے باپ کے پاس گیا، اپنی جان طلب کی، اور پھر بوڑھی ماں کے پاس گیا اس نے بھی جان نہ دی اور کہا: زندگی پیاری ہے اور جان قیمتی چیز ہے، ہم اسے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اب اے بیوی! اے میرے بچوں کی ماں، آیا ہوں کہ اپنے بیٹوں کو تیرے سپرد کردوں۔ میرے اور تیرے کالے پہاڑ تیرے قبضہ میں ہوں گے۔ میرے سرد اور میٹھے چشمے تیری پیاس بجھائیں، لمبی اور اونچی گردن والے گھوڑے میرے طویلوں میں ہیں، تو ان کی پرواہ کرنا، اور میرے عالی شان گھر تیری

دومرول اپنی جگہ سے ہلا اور چلایا: اے بزدل عزرائیل، تمہیں کیا جلدی ہے کہ ہم کو کالے
کپڑے پہنا رہے ۔۔ ابھی تو دیر تک ہم کو کچھ اور کہنا ہے ۔

عزرائیل نے دومرول کو اتنا غضبناک دیکھ کر دومرول کی بیوی کی جان نکالنے کی
ہمت نہ ہوئی، ایک قدم دور چل کر کھڑے ہو گئے ۔

دومرول، طاقتور پہلوان اپنی بیوی کی موت نہیں دیکھ سکتا تھا منہ کھولا اور زور
زور سے بولا: اے خدائے تعالیٰ مجھے نہیں معلوم تو کون ہے، کیا ہے اور کہاں ہے؟ انجان
لوگ تیری تلاش میں آسمان کا ہزاروں چکر لگاتے ہیں تجھے زمین میں تلاش کرتے ہیں ۔
لیکن وہ یہ بالکل نہیں جانتے کہ تو خود انسانوں کے دل میں موجود ہے ۔ اے اللہ میں
راستوں پر سرائیں بنواؤں گا، بھوکوں کا پیٹ بھرواؤں گا اور ننگوں کا تن ڈھانکوں گا
اور میں ساری دنیا کے لیے خوشحالی لاؤں گا ۔ مجھے اپنی بیوی سے پیار ہے اگر تو چاہتا
ہے تو ہم دونوں کی جان ایک ساتھ نکال لے اور اگر نہیں لیتا ہے تو ہم دونوں کی جان
بخش دے ۔۔۔۔

اللہ میاں کو دومرول کی باتیں اچھی لگیں اور عزرائیل کو حکم دیا ۔ اے عزرائیل، یہ
دونوں میاں بیوی ایکسو چالیس سال اور زندہ رہیں گے، تو جا اور دومرول کے ماں باپ
کی جان نکال لے ۔

عزرائیل اٹھے اور دومرول کے ماں باپ کی جان نکال کر لوٹ گئے ۔ دومرول نے
اپنی بیوی اور بچوں کو گلے سے لپٹا لیا اور چوما، سب خوش ہو گئے اور پہلوان گیت گانے
اور خوشی کے گیت اور باجے بجانے، نعرے لگانے ۔ مرد و عورت ناچے، گھوڑے دوڑے
اور اس وقت اوغوز قبیلہ کا بزرگ قورقود دادا آ گیا اور ان کی خوشی میں شامل ہو گیا ۔
دومرول اور اس کی عورت کی زندگی کے واقعات کی کہانی بنائی اور ان کے نام پر
نظم لکھی، تاکہ پہلوان پڑھ کر سنائیں، سنیں اور سبق حاصل کریں ۔

۹ر فروری [illegible] روز دوشنبہ

# ایک شفتالو اور ہزار شفتالو

گاؤں کے کنارے ایک اُجاڑ سا اور خودرو باغ تھا۔ بہت گھنا اور درختوں سے بھرا
طرح طرح کے رس دار میوے کے درختوں سے پُر۔ اتنا بڑا اور گھنا تھا کہ اگر ایک کنارے
سے دوربین لگا کے دیکھا جائے تو تم دوسرے کنارے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

چند سال پہلے زمیندار نے زمین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور دیہاتیوں کو بیچ دیا
تھا لیکن باغ کو اپنے لیے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن گاؤں والی زمین برابر اور درختوں والی
نہیں تھی۔ پانی بھی دور تھا۔ دراصل گاؤں دریا کے بیچ کی ایک بنجر زمین تھی جہاں
زمیندار کا باغ بھی تھا اور کچھ ناہموار زمین ٹیلوں سے اوبڑ تھی اور ٹھیک ذروں کے
نیچے تھی جسے گاؤں والوں نے زمیندار سے خرید لیا تھا اور گندم اور جو بوتے تھے۔

مختصر یہ کہ ہم یہ باتیں چھوڑیں کیونکہ شاید ہماری کہانی سے اس کا تعلق بھی نہیں۔
دو عدد شفتالو کے درخت بھی باغ میں خود بخود اُگ آئے تھے۔ ان میں سے
ایک چھوٹا مگر بڑا زبردست تھا۔ ان دونوں درختوں کی پتیاں اور پھول تقریباً ایک
طرح کے تھے اور ایسے کہ جو کوئی پہلی نظر ڈالتا تھا تو یہ سمجھتا تھا کہ دونوں پیڑ ایک ہی
ہیں۔ بڑا والا پیڑ بہت دیر سے تیار ہوتا تھا اور ہر سال سخت رنگا رنگ خوبصورت شفتالو
پھلتا تھا اور بڑی مشکل سے ہاتھ میں سماتا تھا اور آدمی کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ان
کو کاٹ کر کھائے۔

مالی کہتا تھا کہ بڑے پیڑ کو ایک پردیسی انجینیر نے پیوند کیا تھا جو وہ اپنے ملک سے

دیا تھا ۔ یہ بات معلوم ہے کہ ایسے درخت کے شفتالو جس پر اتنا پیسہ خرچ ہوا ہو کتنے قیمتی ہوں گے ۔

دونوں پیڑوں کے تنے پر چھوٹی چھوٹی تختیوں کے اوپر قرآن کی آیت "وان یکاد" کھدوا کر لٹکا دی گئی تھی تاکہ نظر نہ لگے ۔

چھوٹا شفتالو ہر سال تقریباً ہزار پھول کھلاتا تھا لیکن ایک بھی شفتالو نہیں پھلتا تھا، یا تو اپنے پھول جھاڑ دیتا تھا یا اپنے کچے شفتالوؤں کو پیلا کر کے گرا دیتا تھا۔ باغبان سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ صرف چھوٹے درخت کے لیے کر رہا تھا ۔ لیکن چھوٹا درخت ذرہ برابر نہیں بدلتا تھا۔ سال کے سال زیادہ سے زیادہ شاخیں اور پتیاں اگاتا رہتا لیکن کسی کے علاج کے پیچھے بھی ایک شفتالو بڑا نہیں کرتا تھا ۔

باغبان کے دل میں خیال آیا کہ چھوٹے درخت کو بھی پیوندی بنا دے لیکن درخت پھر بھی نہیں بدلا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ پیڑ نے پھل نہ لانے کی ضد کر لی تھی ۔ آخر کار باغبان تنگ آ گیا ۔ اسے دھوکا دینا چاہتا تھا کہ وہ ڈر جائے، جس وقت آرہ لے کر آیا اور اپنی بیوی کو آواز دی اور شفتالو کے چھوٹے پیڑ کے سامنے آرے کا دانت تیز کرنا شروع کیا۔ پھر جب آرہ اچھی طرح تیز ہو گیا پیچھے پیچھے چلا گیا اور اٹھ کر تیزی سے چھوٹے شفتالو کی طرف جھپٹا جیسے اسے ابھی جڑ سے کاٹ کر پھینک دے گا۔

باغبان ابھی پیڑ کے پاس پہنچا بھی نہ تھا کہ اس کی بیوی نے پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ۔ اسے نہ کاٹو، میں تجھ کو یقین دلاتی ہوں کہ آئندہ سال سے وہ اپنا شفتالو پھلے گا اور بڑے اور پکے پھل دے گا ۔ اگر پھر بھی اس نے کاہلی کی تو ہم پھر اس کا سر کاٹ دیں گے اور چولہے میں جلا دیں گے تاکہ جل کر راکھ ہو جائے ۔

یہ دھمکی، دھوکا اور سفارش بھی شفتالو کے چھوٹے پیڑ کو نہ ڈرا سکی ۔ بے شبہ تم سب جاننا چاہو گے کہ شفتالو کے چھوٹے پیڑ کا کہنا کیا تھا اور کیوں وہ اپنے شفتالو پکنے نہیں دیتا تھا ۔ یہاں سے آگے ہمارا قصہ خود اس کی تفصیل سنائے گا ۔

• • •

غور سے سنو ۔۔۔ دنیا کان کھول کر سنو کہ شفتالو کا چھوٹا پیڑ خود بات کرنا چاہتا ہے ۔ اب ہوتا نہیں کیونکہ دیکھیں کہ شفتالو کا چھوٹا درخت کیا کہہ رہا ہے ۔ ایسا جیسے اپنی

رام کہانی سنا رہا ہے ۔

ہم دو سو پچاس شفتالو تھے اور ایک ٹوکری میں رکھے گئے تھے باغبان نے ٹوکری کے اوپر نیچے اور چاروں طرف انگور کے پتے لگا رکھے تھے کہ دھوپ ہمارے نازک چھلکوں کو جھلسا نہ دے اور ہمارے سرخ رنگ پر گرد و غبار نہ پڑ جائے صرف تھوڑی سی روشنی پتوں کے درمیان سے آ رہی تھی اور جہاں کہ ہمارے چہرے کا سرخ رنگ ملتا تھا ایک خوبصورت منظر بن گیا تھا ۔

باغبان نے ہمیں صبح سورج نکلنے سے پہلے توڑ لیا تھا اس لیے ہمارا بدن ٹھنڈا اور بھیگا ہوا تھا ۔ اکتوبر کی راتوں کی گلابی سردی ابھی تک ہمارے جسموں پر تھی اور پتوں کے بیچ سے بہت تھوڑی گرمی اندر آ رہی تھی اور ہمارے بدن میں داخل ہو رہی تھی ۔

البتہ ہم ایک ہی درخت کی اولاد تھے ۔ باغبان ہر سال اسی موسم میں میری درخت ماں کے سینے سے تمام شفتالو توڑ لیتا تھا ، ٹوکری میں بھرتا تھا اور شہر لے جاتا تھا ۔ آہستہ آہستہ چلتا اور رئیسوں کا دروازہ کھٹکھٹاتا تھا ، ڈلیہ حوالے کرتا اور ہمیشہ کی طرح اپنے گھر لوٹ آتا ۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ہم دو سو پچاس شفتالو تھے اور رس دار تھے ۔ میں اپنے بارے میں بتاتا ہوں کہ خوب میٹھے رس اور لذت سے بھرا ہوا تھا ۔ میرا نازک اور نرم چھلکا چاٹا جانا چاہتا تھا ، میرے رنگ میں سرخی اس طرح سے دوڑ گئی تھی کہ اگر تم مجھے دیکھتے ، تو خیال کرتے کہ یقیناً میں اپنے ننگے پن میں شرما رہا تھا ۔ خاص طور پر یوں کہ میرا سر اور پیٹ ابھی اکتوبر کی شبنم سے بھیگا ہوا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا میں نے نہا لیا ہے ۔

میری سخت اور تیز شگفتگی ایک نئی زندگی کے خیال میں تھی ۔ بہتر ہے میں یہ کہوں کہ میں خود ہی ایک دوسری زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا میری شگفتگی مجھ سے جدا نہیں تھی ۔

باغبان نے مجھے ڈلیہ کے اوپر رکھ چھوڑا تھا تاکہ میں پہلی نگاہ میں دکھائی دے جاؤں شاید اس وجہ سے کہ میں سب سے زیادہ رس دار تھا ۔ یقیناً میں اپنی تعریف نہیں کر رہا ہوں ۔ ہر شفتالو جس میں رس بھرنے اور پک جانے کی طاقت ہوگی ' تازہ اور رس دار ہوگا لیکن جو شفتالو ڈر کر کانپا کرتے ہیں اور کیڑوں کا دھوکا کھا جاتے ہیں اور انھیں اندر داخل

ہوتا جاتا اور میں اپنی اماں کے بازوؤں کو جھکا دیتا اور تڑپ لیکتا تھا۔
میری اماں کہتی تھی: میری خوبصورت بیٹی۔ اپنے آپ کو دھوپ سے دُور چھپا۔
سورج ہمارا دوست ہے۔ زمین ہم کو غذا دیتی ہے اور سورج اُسے پکاتا ہے۔ اس کے علاوہ تیری خوبصورتی سورج سے ہے، دیکھ جو دھوپ سے اپنے آپ کو چھپاتے ہیں کتنے پیلے اور کمزور ہیں میری حسین بیٹی، یہ جان لے کہ اگر کسی دن سورج زمین سے خفا ہو جائے اور اس پر نہ چمکے تو پھر ساری زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہ جائے گا، نہ تو گھاس پھوس اور نہ کوئی سانس لینے والی چیز۔
اس لیے جہاں تک میں کر سکتا تھا اپنے بدن کو دھوپ کے سپرد کر دیتا تھا اور سورج کی حرارت پیتا تھا اور اپنے اندر جمع کرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ میری طاقت دن بہ دن زیادہ ہو رہی ہے۔۔۔ میں بیٹھے اپنے آپ سے پوچھا کرتا تھا۔
"اگر کسی دن کوئی سورج کو تکلیف پہنچائے اور سورج ہم سے خفا ہو جائے تو ہم اپنے اوپر کتنی بڑی مصیبت نازل کریں گے" آخر کار مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور اپنی اماں سے پوچھا: ماں اگر کسی دن کوئی سورج کو ستائے اور سورج دیوتا ہم سے خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں گے؟
میری ماں نے اپنی چونچ سے میرے چہرہ کی گرد اور دھول صاف کی اور بولی:
کیا باتیں سوچتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تو ہوشیار لڑکی ہے۔ جانتی ہے میری بیٹی، تو جانتی ہے کہ سورج دیوتا صرف کچھ آدمیوں کے لیے ہم سے خفا نہیں ہو جائیں گے۔ صرف یہ ممکن ہے کہ ایک روز آہستہ آہستہ اس کی روشنی اور گرمی کم ہو جائے اس وقت ہمیں دوسرے سورج کی فکر کرنی پڑے گی ورنہ ہم اندھیرے میں رہ جائیں گے اور تم ٹھنڈک سے برف ہو کر سوکھ جائیں گے۔
ارے میں کہانی سُنا رہا تھا!
ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ گرمی میری کھال تک پہنچی اور میں پیاسی ہو گئی تھوڑی دیر بعد میرے بدن کا شیرہ ابلنے لگا اور میری جلد سوکھنے لگی اور باہر بہنے لگا۔ ایک چھوٹا دروازہ آ گیا اور میرے چاروں طرف چکر کھانے لگا۔
جس وقت میں دُنیا سے باہر گر پڑا تھا، میرا چھلکا ایک جگہ سے چھل گیا تھا اور میرا

تھوڑا شیرہ باہر نکل آیا تھا اور دھوپ سے جم گیا تھا۔ چیونٹے نے اپنا سونڈ شیرہ میں
دھنسایا، پھر چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر تک اپنے سونڈ کے نشان پر حیران رہا، پھر دوبارہ اپنا
ڈنک گھسایا، اپنے پچھلے پھیلائے رہا اور پیر زمین پر گاڑ دیے اور اس زور سے کھینچنا
شروع کیا کہ میں سمجھا کہ اب اس کا سونڈ اپنی جگہ سے نکل جائے گا۔ چیونٹے نے تھوڑا
زور اور لگایا۔ آخر کار جمع کیے ہوئے شیرہ میں سے تھوڑا پا گیا اور خوش ہو کر دوڑتا
دوڑتا مجھ سے دور ہو گیا۔

یہی وقت تھا کہ میں نے ایک آواز سنی۔ دو آدمی باغ کی دیوار پر سے اندر اترے
اور دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ یہ صاحب علی اور بولاد تھے اور آئے تھے کہ اپنا پیٹ
میوے سے بھریں۔ ان دوسرے گاؤں والوں کی طرح مالی کی بندوق سے بالکل نہیں
ڈرتے تھے۔ دوسرے گاؤں والے باغ میں کبھی قدم نہیں رکھتے تھے لیکن بولاد اور
صاحب علی ہمیشہ ننگے پیر اور پاجامے کا پھٹا ہوا پائنچہ لٹکائے ہوئے باغ میں موجود رہتے
تھے۔ باغبان نے کئی دفعہ ان کے بھاگنے کے پیچھے گولیاں چلائی تھیں لیکن بولاد اور
صاحب علی ہمیشہ نکل گئے تھے۔ اس وقت دونوں سات آٹھ سال کی عمروں کے تھے۔

خلاصہ، اس دن دوڑتے دوڑتے آئے اور میری طرف جھپٹے اور میری چڑیاں کے
پاس گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ لوٹ رہے ہیں لیکن وہ بری طرح مایوس
ہیں۔ ان کی باتوں سے میں نے سمجھا کہ باغبان سے جھگڑے ہوئے ہیں۔

بولاد کہہ رہا تھا: تم نے دیکھا، باغ کا یہ آخری پھل بھی ہماری قسمت میں نہیں
تھا۔ صاحب علی بولا: آخر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے کہ گدھا لال بندوق
ہاتھ میں لیے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا ہے اور پکا کر نہیں دیتا ہے۔

بولاد نے کہا: لعنتی کتے کا باپ! ایک دانہ بھی ہم لوگوں کے لیے نہیں چھوڑا ہے
آہ، میرا دل کتنا چاہتا تھا کہ ایسے رس دار پھل کو اپنے دانتوں میں زور سے دبا کر کھاؤں
... تجھے یاد ہے کہ پار سال ہم نے کتنے شفتالو کھائے تھے؟

صاحب علی بولا: معلوم ہوتا ہے کہ ہم آدمی نہیں ہیں۔ ساری چیزوں کو ایک ایک
کر کے توڑ لیتا ہے اور بے جا کر اس آدمی کے حوالے کر دیتا ہے جو زمیندار ہے اور حرام
کا کھاتا ہے۔ سارا قصور ہم لوگوں کا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور چھوڑ دیا

پہنچ کر گاؤں کو ہڑپ کر جائے ۔

پولاد بولا ۔ جانتے ہو صا جبلی، یا تو یہ باغ پورے گاؤں کا ہو جائے یا پھر میں اس کے سارے پیڑوں میں آگ لگا دوں گا ۔

صا جبلی بولا : ہم دونوں آگ لگائیں گے ۔

پولاد نے کہا : ہم بے غیرت ہیں اگر آگ نہ لگائیں ۔

صا جبلی نے کہا : اگر ہم آگ نہ لگا دیں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں ۔

بچے اتنے غضبناک تھے اور زمین پر اپنے پیر پٹک رہے تھے کہ میں ڈر گیا کہ کہیں مجھے لات نہ مار دیں لیکن انہیں ٹھوکر نہیں ماری ۔ میں ٹھیک ان کے سامنے تھا کہ پولاد کے پیروں میں ایک کانٹا دھنس گیا ۔ پولاد جھکا ، کانٹا باہر نکالا ہی تھا کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور پیر کا کانٹا بھول گیا ۔ مجھے زمین سے اٹھایا اور صا جبلی سے بولا : دیکھو صا جبلی !

بچے مجھے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں دے رہے تھے اور خوشی منا رہے تھے ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ مجھے اسی طرح کھا جائیں میں بہت گرم تھا ۔ میرا دل چاہتا تھا کہ مجھے ٹھنڈا کر لیں پھر کھائیں تاکہ میں ان کے دانتوں کو زیادہ مزہ دوں ۔ ان کا پھٹا اور گندا ہاتھ میری کھال چھیلے دے رہا تھا لیکن میں خوش تھی چونکہ میں جانتی تھی کہ مجھے آخری ذرے تک مزہ لے لے کر کھائیں گے اور کھانے کے بعد اپنے ہونٹوں اور انگلیوں کو چاٹیں گے اور میں ہفتوں اور دنوں تک ان کے دانتوں کے نیچے مزہ دیتا رہوں گا ۔

صا جبلی بولا : پولاد ، میں شرط لگاتا ہوں ابھی تک ہم نے اتنا زبردست شفتالو نہیں دیکھا تھا ۔

پولاد نے کہا : نہیں ، کبھی نہیں دیکھا تھا ۔

صا جبلی بولا : چلو تالاب کے کنارے چلیں ، اسے ٹھنڈا کریں کھائیں ، بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے ۔

مجھے اتنی حفاظت سے لیے جا رہے تھے کہ گویا میرا بدن نازک شیشہ کا بنا ہوا تھا اور میں ایک جھٹکے سے گر کر چور چور ہو جاؤں گا ۔

تالاب کے کنارے سایہ تھا، ٹھنڈک تھی، بید اور جھاؤ کے درختوں نے ایسی
ٹھنڈی سی چھاؤں بنا رکھی تھی کہ میں نے اپنی پہلی سانس ہی میں اپنی کھال تک میں بڑی
کا اثر محسوس کیا۔ مجھے احتیاط سے پانی میں ڈالا اور اپنے چار گڑے اور پھیلے ہوئے
ہاتھوں کو سامنے رکھا کہ کہیں میں گھبرا کر نہ چل جاؤں۔ پانی کافی ٹھنڈا تھا۔ تھوڑی
دیر تک بیٹھ کر پولادیولا: صاجیلی!

صاجیلی نے کہا، ہاں۔

پولادیولا: میں کہتا ہوں کہ اس ٹھنڈک کی بڑی قیمت ہے!

صاجیلی نے کہا۔ ہاں۔

پولادیولا: ہاں کہنا کافی نہیں ہے، اگر جانتے ہو تو بتاؤ کتنی قیمت کا ہوگا؟

صاجیلی تھوڑا سوچ کر بولا: اگر ہم اسے اسی طرح ٹھنڈا کر سکتے اس کا دام ہزار تومان۔

پولادیولا: تو دیکھا نہیں اور بتا دیا کہ ہزار تومان دام ہوا۔

صاجیلی بولا اچھا، تو تو جیسے ماشاءاللہ خزانے کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ بتا کتنا؟

پولادیولا: سو تومان۔

صاجیلی نے کہا: کیا ہزار سو سے زیادہ ہے؟

پولادیولا: تو مر جائے، میں یہ بات خود نہیں کہہ رہا ہوں۔ اپنے باپ سے سنا ہے۔

صاجیلی نے کہا، اگر ایسا ہے تو شاید دونوں ایک ہی ہو، میں بھی اپنے آپ
یہ بات نہیں بتا رہا ہوں۔ اپنے ابا ہی سے سنا ہے۔

پولادیولا نے مجھے دھیرے دھیرے چھوا اور کہا: میرا ہاتھ تو برف ہو گیا۔ میرے خیال
میں اسے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔

صاجیلی نے مجھے احتیاط سے چھوا اور بولا: ہاں ٹھنڈا ٹھنڈا ہے۔

اس وقت مجھ کو پانی سے باہر نکالا۔ پانی سے باہر آتے ہی میں نے گرمی محسوس کی۔
اب میرا دل چاہتا تھا کہ مجھے جلد کھا لیں تاکہ انھیں پتہ لگ جائے کہ میں اس سے
زیادہ مزیدار ہوں جتنا وہ سوچتے ہیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ ساری طاقت اور گرمی جو
کہ میں نے اپنی ماں اور سورج سے حاصل کی تھی ان دو دہاتی بچوں کے جسم میں داخل
کر دوں۔

جس وقت کہ پولاد اور صاجعلی میرے کھانے کا ارادہ کر رہے تھے میں اس فکر میں تھی کہ میں اپنی زندگی میں کتنی مختلف صورتوں سے گزر رہی ہوں اور ابھی کتنی باقی ہوں گی۔ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی کہ ایک دن میرے جسم کے ذرات پانی اور مٹی تھے اور ان میں سے بعض سورج کی چمک تھی۔ میری ماں تھوڑا تھوڑا زمین سے حاصل کرتی تھی اور پھر اپنی ٹہنیوں کی نوک تک لاتی تھی۔ پھر میری ماں نے کلیاں کھلائیں پھر پھول بنایا اور پھر آہستہ آہستہ میں بنی۔ میں اپنے بدن کے ذرات کو تھوڑا تھوڑا اپنی ماں سے جوڑتا اور پھر سورج کے نور کے ذروں سے سبز ہوگئی پھر میرا بیج، چھلکا اور گودا بنا اور پھر میں پکا اور رس دار شفتالو بن گیا۔ لیکن اب پولاد اور صاجعلی مجھے کھا رہے ہیں اور کچھ دیر بعد میرے بدن کے ذرات ان کے جسم کے گوشت، ہڈی اور بال کا حصہ بن جائیں گے۔ البتہ وہ بھی ایک روز مر جائیں گے۔ اس وقت میرے بدن کے ذرات کیا ہوں گے؟

انہوں نے مجھے کھانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ صاجعلی نے مجھے پولاد کو دیا اور بولا: ایک دانت کاٹو۔

پولاد نے ایک گال کھایا اور مجھے صاجعلی کو دے کر اپنے ہونٹوں کو چوسنا شروع کر دیا۔ صاجعلی نے بھی ایک گال کاٹا اور مجھے پولاد کے حوالے کر دیا۔

جس طرح میں نے خود ہی کہا تھا میں نے ان کے دانتوں میں بڑا مزہ دیا۔ اب میرے جسم کا گودا کم ہو جاتا تھا لیکن میری گٹھلی تازہ زندگی کے خیال میں تھی۔ ایک منٹ بعد شفتالو کے نام کا میرا کوئی نشان باقی نہ رہ گیا۔ جبکہ میری گٹھلی سوچ رہی تھی کہ کب اور کس طرح اگنا شروع کرے گی۔ میں مقررہ زمانے میں مرتی بھی تھی اور زندہ بھی ہو جاتی تھی۔

آخری بار پولاد نے مجھے اپنے منہ میں رکھا اور میرے گودے کا آخری ذرہ چبا لیا اور گھونٹ لیا اور جس وقت مجھے دوبارہ باہر لایا تو اب میں وہ شفتالو نہ تھا۔ ایک زندہ گٹھلی تھا کہ جس کا چھلکا بہت سخت تھا اور اس کے اندر نئی زندگی کا بیج چھپا ہوا تھا۔ صرف مجھے تھوڑے سے آرام اور نرم مٹی کی ضرورت تھی کہ میں اپنا چھلکا پھاڑ ڈالوں اور [illegible] بن جاؤں۔

جس وقت بچے اپنے ہونٹ اور دبی انگلی چاٹ رہے تھے، فولاد بولا: اب ہم کیا کریں؟

صاحبعلی نے کہا: چلو تالاب میں چلیں۔

فولاد بولا: ہم اس کی مچھلی نہیں کھائیں گے کیا؟

صاحبعلی بولا: اس کے لیے میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ ابھی رہنے دو۔

فولاد نے مچھلی بید کے درخت کے نیچے رکھی اور پیچھے پیچھے جاکر یکایک اٹھ کر دوڑا اور چشمے کے پل کو پھلانگ کر پانی میں کود گیا اور اپنے پیروں کو سکوڑ کر پیٹ سے ملایا اور ہاتھوں سے پکڑا اور تیرا۔ پھر پانی کے اندر گیا۔ ہاتھ پیر مارے اور سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کے ہر طرف سے کیچڑ اور کوڑا نکل آیا۔ پانی اس کی تھوڑی تک پہنچ رہا تھا۔ پانی کا جھاگ اس کے چہرہ اور کان اور سر پر جما ہوا تھا۔

صاحبعلی بولا: فولاد، اپنا منہ کو صاف کرے۔

فولاد نے پوچھا: کیا تم اپنا پاجامہ اتار رہے ہو؟

صاحبعلی نے کہا: ہاں، میں چاہتا ہوں کہ میرے ابا جان لیں کہ میں پھر نہانے اور تیرنے گیا۔ مجھے مارے گا۔

فولاد بولا: ابھی ظہر ہے۔ ہمیں گھر لوٹنا چاہیے۔ ابھی بہت وقت ہے۔

صاحبعلی بولا: کیا سورج کو اپنے سر پر نہیں دیکھتے ہو؟

فولاد اب کچھ نہ بولا اور اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ جس وقت صاحبعلی کے پانی میں کودنے کی آواز سنائی دی، فولاد نے اپنا چہرہ گھمایا اور پھر دونوں نے تیرنا اور ڈبکیاں لگانا شروع کیا اور دونوں ایک دوسرے کے اوپر پانی پھینکتے ہوئے بولے: بہت دیر ہو رہی ہے۔ باہر چلے آئے۔ فولاد نے اپنے پاجامے کے پائنچوں کو چند بار جھٹکا، پھر مچھلی بید کے پیڑ کے نیچے سے اٹھایا اور گھر کی طرف چل پڑے۔ باغ کی دیوار سے باہر کود کے اور روانہ ہو گئے۔ گاؤں زمیندار کے باغ سے کافی دوری پر تھا۔

فولاد بولا: اچھا، تو نے اس کے لیے کیا پروگرام بنایا تھا۔

صاحبعلی نے بتایا: جب شام ہو جائے گی میں تجھے آکر بلاؤں گا۔ ہم جاکر نہر پر بیٹھیں گے پھر میں تجھے بتاؤں گا کہ اس مچھلی کے بارے میں میں نے کیا سوچا ہے؟

گاؤں کی گلیاں خالی لیکن مکھیوں اور بدبو سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک موٹا کتا دیوار

کے اوپر سے چارے پاؤں کے سامنے کو دار، پولاد نے اپنا ہاتھ کتے کے سر اور چہرے پر پھیرا، جھکا اور اپنے گھر چلا گیا۔ کتا بھی اس کے پیچھے گھر میں گھس گیا۔

گلی آگے کی طرف جاکر اونچی ہوگئی تھی جہاں آخری سرے کی پٹری پر ایک گھری چھت پولاد کا گھر تھی۔ صاجعلی اس چھت کے راستے گھر میں گیا، مجھے اپنی مٹھی میں بھینچا اور صحن میں کودا۔ اس کا پیر ٹخنوں تک گوبر میں دھنس گیا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی ماں ڈال گئی تھی اور صاجعلی کو معلوم نہ تھا۔ اس کی اماں نے کودنے کی آواز سن کر گھر کے کونے میں سے اپنا سر نکالا اور بولی: صاجعلی جلدی کر آ اور اپنے آبا کے لیے تھوڑی روٹی اور پانی لے جا۔

صاجعلی مجھے طویلے میں لے گیا اور ایک کونے میں ایک چوڑا گڑھا کھودا اور مجھے لٹا دیا پھر مجھے سوائے اندھیرے کے اور بدبو کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مجھے معلوم نہیں میں وہاں کتنی دیر رہا۔ بدبو سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ آخرکار مجھے محسوس ہوا کہ مجھے گڑھے میں سے نکالا جا رہا ہے۔ صاجعلی تھا، مجھے نکالا اور ایک بار اپنے ہاتھوں میں ملا اور پاجامے پر گھسا اور میں صاف ہو گیا جس راستے ہم آئے تھے۔ واپس گئے اور پھر پولاد کے گھر کی چھت پر گئے، پولاد کی ماں اور بہن گندا بنا رہی تھیں اور ہمسایے سے بات کر رہی تھیں جو کوٹھے ہوئے اپلوں کو دیوار سے اکھاڑ کر ڈھیر بنا رہی تھی۔

صاجعلی نے پولاد کی ماں سے پوچھا کہ پولاد کہاں ہے؟

پولاد کی اماں نے بتایا کہ پولاد بکریوں کو لے کر جنگل گیا ہے گھر میں نہیں ہے۔

پولاد کو اپنے جنگل کے ٹیلے پر ہم نے پایا۔ اپنی کالی بکریوں کو ٹیلے پر بٹھایا ہوا چرا رہا تھا اور خود ہم دونوں کا انتظار اپنا کتا لیے کر رہا تھا۔ میں نے اچانک دیکھا کہ پولاد اور صاجعلی کی جلد کا رنگ میرے چہرے کی طرح سب ہے۔ دونوں ننگے بدن دھوپ میں اتنا چلے تھے کہ کالے سیاہ ہو گئے تھے۔

پولاد نے بے صبری سے کہا، اچھا اپنی ترکیب بتاؤ۔

صاجعلی بولا: کیا ایک شفتالو کے پیڑ کے مالک ہونا چاہتے ہو؟

پولاد نے کہا: کیا میں پاگل ہوں کہ نہیں چاہوں گا؟

صاجعلی نے کہا۔ بس پھر ہم چلیں۔

اس ترتیب سے میں اس وقت جوشش و خروش میں مبتلا تھی اور مٹی کے اندر میٹھی
نیند میں مست ہو گئی۔ میں سو گئی تاکہ بہار کے زمانے میں ایک نئی طاقت کے ساتھ جاگ
سکوں۔ گاؤں بستی سے باہر نکل آؤں اور صاحب علی اور پولاد کے لیے پھلدار درخت بن
جاؤں۔ ایسا درخت جو رس دار اور زرد پوست شفتالوؤں کی طرح جو اپنے رنگین چہروں
پر خوبصورت لڑکیوں کے چہروں کی شرماہٹ لیے ہوں۔

جو خواب میں نے جاڑے کے دنوں میں دیکھے مجھے زیادہ تر یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے
کہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں ایک بڑا درخت بن گئی ہوں، پولاد اور صاحب علی میری ٹہنیوں
پر چڑھے ہوئے ہیں، شاخیں ہلا رہے ہیں اور گاؤں کے سارے ننگے بچے میرے پاؤں میں
جمع ہو گئے ہیں اور میرے شفتالو کو ہوا میں اچھال رہے ہیں اور مزے لے کر کھا رہے ہیں
اور ان کے منہ سے شیرہ بہہ رہا ہے اور ان کے ناف اور پیٹ بھیگ رہے ہیں، ایک چھوٹا
بچہ پولاد کو آواز دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ جب اپنے گھر لوٹ کر جاؤں تو اپنی دادی کو بتاؤں
کہ میں نے کیا کھایا اور کتنا زیادہ کھایا لیکن بہت زیادہ مزیدار تھا، ابھی تک میرا دل بھرا
نہیں ہے اور زیادہ کھانے کا خواہشمند ہوں اور شرط بدنے کے لیے تیار ہوں کہ پھر
بھی سیر نہیں ہوں گا۔

وہاں دوسرے بچے بھی تھے جن کے بدن پر کچھ قبائیں تھیں اور بہت سی مکھیاں ان
کے کان، ناک، منہ اور پیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں، تمام بچے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے
شفتالو لیے ہوئے تھے اور مزے لے لے کر کاٹ رہے تھے اور واہ واہ کہہ رہے تھے۔

یہ میرے خوابوں میں سے ایک خواب تھا۔

میں نے آخری بار بادام کے پھول خواب میں دیکھے تھے۔

میں بیدار ہوئی تو ہر طرف شور سا پڑا ہوا تھا اور یکایک ایک نرم آواز بلند ہوئی اور میں نے
محسوس کیا کہ آواز کے ساتھ بہت سی جانی پہچانی خوشبوئیں مٹی کے اندر داخل ہو گئیں۔
آواز نے کہا۔ بادام کے پھول آ گئے اور اپنی خوشبو، خوبصورت چہرے اور بدن پر بکھیر دیے تاکہ
وہ پھولوں کی خوشبو کو سونگھ لے، منتظر رہ کر دیکھے جس قدر جلد جگا دے تاکہ اس کے اُگنے
اور کھلنے کا وقت ہے۔ تمام کلیاں جاگنے ہی جا رہی ہیں۔

بادام کے پھولوں کی خوشبو اور اس کے لمس نے جو میرے بدن اور چہرے پر بکھیرے

جا رہے تھے۔ ایسے اچھے لگ رہے تھے کہ میرا دل چاہ رہا تھا میں ہمیشہ بیہوش رہوں، لیکن میں ہوش میں آ گئی۔ میں نے چاہا کہ خود کو دوبارہ بیہوشی میں مبتلا کر لوں، مگر گل بادام بولا۔ اب زیادہ نخرے مت کرو میری عزیزہ۔ تم زندگی کے بیج کو اپنے سینے میں دبائے رکھتی ہو اور ارادہ کر لیا ہے کہ اُگے اور ایک بڑا درخت بن کر پھل لائے، ایسا ہے نہ ؟

بادام کا پھول ایک دلہن کی طرح تھا جس نے برف جیسا سفید اور صاف لباس پہن رکھا تھا اور اپنے ہونٹوں پر پھول کھلا رکھے تھے۔ البتہ میں نے ابھی برف نہیں دیکھی تھی۔ میں نے برف کا ذکر اپنی ماں سے اس وقت سنا تھا جس وقت میں شگفتہ ہوئی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ معلوم کروں کہ بادام کا پھول پہلے کس سے بات کر رہا تھا اور کون اسے میرے سرہانے لایا تھا۔ گل بادام نے اپنے ہاتھ میری گردن میں ڈال دیے مجھے چوما اور ہنس کر کہا کیسی سوئی اور تندرست بدن کی ہو۔ میرے ہاتھوں میں ٹھیک آ رہی ہو۔

پھر بولا: بہار بھی دیر تھی، بتایا تھا کہ تمہارے اُگنے اور پھوٹنے کا وقت ہے۔

بہار کا نام سنتے ہی جیسے میں سوتے سے جاگ پڑی۔ میں نے سوچا کہ بہار اگر چلی گئی اور میں نے تو ابھی کونپل بھی نہیں نکالی ہے۔ اس پریشان خیال سے گھبرا کر میں نیند سے چونکی تو دیکھا کہ میرے بھیگے اور اندھیرے گھر کو گرد میرے لیے کھلا رہی ہے۔ میرا چھلکا باہر سے بھیگا اور اندر سے پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ پانی کا قطرہ میرے سر اور چہرے سے گر کر میرے بدن کے چاروں طرف نیچے بہا چلا آ رہا تھا اور مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ خاک کے چند دانے جو میرے چاروں طرف پڑے ہوئے تھے، اپنے ریشے پھیلانے کے چکر میں تھے۔ ان میں سے ایک نے تو اپنا قد سیدھا بھی کر لیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ مٹی سے اوپر نکل بھی گیا ہے۔ اس کے نازک ریشے اپنا سر ادھر اُدھر اٹھا رہے تھے اور پانی کے ذرات اور غذائی چیزوں کو حاصل کر رہے تھے اور اکٹھا کر کے اوپر کھینچ رہے تھے۔ ایک اور اناج کا دانہ بھی تھا جس نے چھوٹی سی جڑ اگائی تھی اور اپنا جڑ نکال لیا تھا اور مٹی کو دھیرے دھیرے ہٹاتا ہوا اوپر چلا جا رہا تھا۔ شاید ارادہ کر چکا تھا کہ دو دن کے اندر نکلتے ہوئے سورج کو دیکھے گا۔

ایک تازہ ریشہ میرے جسم سے الگ ہو رہا تھا اور جتنا ہی آگے بڑھ رہا تھا اور

اب جبکہ میں درخت ہوتا جا رہی تھی تو ایک نامکمل گٹھلی اور ادھورے درخت کے بیچ یہ
فرق ہو جاتا ہے کہ پختہ گٹھلی درخت بن جانے کی کیفیت میں تھی اور اگر نہ بنی تو سڑ جائے گی
لیکن نامکمل درخت مستقبل میں ایک اچھا درخت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

درحقیقت تمام چیزیں لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور جس وقت یہ تبدیلیاں
ایک دوسرے پر چڑھتی گئیں اور ایک مقررہ مقدار پر پہنچ گئیں تب ہم محسوس کرتے ہیں
اب یہ چیز پہلے جیسی نہیں بلکہ کوئی اور دوسری چیز ہے۔ مثلاً میں خود اب وہ گٹھلی نہیں
تھی بلکہ ایک درخت کی شکل میں تھی۔ جڑ اور ڈنٹھل والی تھی اور نیچے اور کونپلوں کو
اپنے سر پر جھکے ہوئے تھی اور برابر اوپر کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ میں چاہتی تھی جلد چھت
میں مٹی سے باہر آؤں تو اپنی کونپلوں کو دھوپ کے سامنے پھیلا دوں سورج ان کو
ہرے رنگ میں رنگ دے۔ کلیوں سے بھری ہوئی اور رس دار شگفتہ لوزوں سے لدی ہوئی
پھول سے خالی ڈال کا خیال اپنے ذہن میں پکا کرتی تھی۔ میں ایک معمولی سا پیڑ تھی،
اس کے باوجود میرے سامنے چمکیلا مستقبل تھا!......

ایک اخروٹ کے برابر کنکر نے میرا راستہ روک رکھا تھا اور مجھے اوپر نہیں جانے
دیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس میں سوراخ نہیں کر سکتی مجبور ہو کر میں نے چکر لگایا
اور اوپر کی طرف نکل گئی۔

میں جتنا اوپر جاتی رہی دھوپ کی گرمی زیادہ تر محسوس کرتی رہی اور زیادہ سورج
کی طرف بڑھتی رہی اب میں اُگی ہوئی گھاسوں کے بیچ سے نکل کر زمین پر بڑھتی رہی۔
آخرکار میں ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں سورج کی روشنی نے مٹی کو صاف شفاف بنا رکھا تھا۔
اب میں سمجھی کہ میرے سر پر سوائے ایک نازک کھال کے اور کچھ نہ تھا۔ تھوڑی دیر
بعد صرف سر کے ایک جھٹکے سے میں نے مٹی پھاڑ دی اور روشنی اور گرمی کو پایا جو میرے
پیروں تک آ رہی تھی۔

میں اب زمین پر تھی۔ وہ زمین جو میری ماں کی ماں تھی، میری ماں بھی ہے اور
ساری زندہ چیزوں کی بھی ماں ہے۔

زمین کے اس حصے پر بادام کا پیڑ سر سے پیر تک سفید دھوپ میں چمک رہا تھا اور
ایسا خوش تھا کہ مجھے بھی خوشی کے جھولے جھلانے لگا۔ میں نے سلام کیا تو بادام کے درخت

نے کہا۔ تمہارے چاند سے چہرے پہ سلام، میری عزیز بیٹی سپتا مبارک ہو، زمین میں کیا حال چال ہے؟

خاکیسر کی جھاڑیاں لمبی ہو گئی تھیں اور اپنا سایہ ڈال رہی تھیں لیکن میں ابھی صرف دو کچھ پتوں سے زیادہ نہ رکھتی تھی اور آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھا رہی تھی۔

جس روز کہ صاعجلی اور پولاد میری تلاش میں آئے، میرے اندر دس بارہ ہری پتیاں نکل آئی تھیں اور میرا قد بعض دوسرے پودوں سے زیادہ اونچا تھا لیکن خاکیسر کے جھاڑ پھر بھی مجھ سے بلند تھے۔ وہ اتنی جلدی اور تیزی کے ساتھ بڑھ رہے تھے کہ مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں یہی سوچ رہی تھی کہ بس کچھ اور روز میں ان کا قد بادام کے پیڑ سے بھی زیادہ اونچا ہو جائے گا لیکن جب غور سے دیکھا کہ ان کی جڑیں اور ریشے زمین کے بہت زیادہ اندر نہیں ہیں تو اپنے آپ سے بولی کہ خاکیسر کے یہ جھاڑ جلد ہی مرجھا جائیں گے اور ان کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔

پولاد اور صاعجلی مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ دونوں نے کہا، یہ پیرجاب جا رہا ہے۔
کوئی شخص پانی بھر بھر کر لائے میری جڑ میں ڈالا اور پھر واپس چلے گئے۔ باغبان کہیں دور کیاریوں میں پانی دے رہا تھا اور اس کے بیلچے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

یہ بہار کے آخری دن تھے جب میں نے دیکھا کہ خاکیسر کے جھاڑ ایسے ہو گئے ہیں گویا اب بڑھیں گے نہیں۔ وہ پھول لے چکے تھے اور اپنے دانے زمین میں بکھیر رہے تھے اور دھیرے دھیرے پیلے پڑتے جا رہے تھے۔ جیسے ہی گرمی آئی میں بھی ان کے تبدیل ہو گئی لیکن ابھی میری شاخیں نہیں نکل تھیں۔ میں چاہتی تھی کہ جلد لمبی ہو جاؤں پھر شاخیں نکالوں۔

پولاد اور صاعجلی میرے پاس زیادہ آتے تھے اور کبھی تھوڑی دیر تک بیٹھتے تھے اور میرے مستقبل اور اپنے آئندہ کے پروگرام سوچتے تھے۔ ایک دن ایک مرا سفید بڑا سانپ بھی لائے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سر ڈنڈے مار کر کچل دیا گیا تھا۔ پھر میرے آس پاس کی زمین تقریباً آدھے میٹر کے برابر کھود دی اور اسی میں سانپ کو دفن کر دیا۔

پولاد نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ بڑا زبردست ہوگا!

یقیناً اس کا اشارہ میری طرف تھا۔
صاجعلی نے پوچھا: ایک سال پہ کتنی کھاد اور کتنی گوبر کے برابر ہے؟
پولاد بولا: میرا خیال ہے کہ آنے والے سال میں ہم اس کا پہلا پھل کھائیں گے۔
صاجعلی نے کہا: میں کیا جانتا ہوں، ہمارے پاس اب تک تو کوئی درخت نہیں تھا
پولاد نے کہا: ٹھیک ہے، میں نے سنا ہے کہ شفتالو اور خوبانی کے پودے بہت جلد پھل لاتے ہیں۔

میں خود بھی یہ جانتی تھی۔ میری ماں دو سال میں دو نئے پھل پھلی تھی۔
میں سوچتی تھی کہ جس وقت میرے شفتالو بڑے ہوں گے اور پک جائیں گے، نہیں کس شکل کی ہوں گی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ جلد از جلد پھل لاؤں تاکہ معلوم ہو کہ شفتالو کس طرح میرے بدن کا رس چوسیں گے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میرے شفتالو بھاری بھاری ہوں تاکہ میری ڈالیاں جھک جائیں۔ اور اس قدر کہ وہ زمین کو چھونے لگیں۔
گرمیاں گزر گئیں اور جاڑوں کی آمد آمد ہوگئی۔
اپنے بدن کے اندر میں نے نازک نازک پائپ پیدا کر لیے تھے کہ جو کچھ میری جڑیں زمین سے حاصل کرتی تھیں وہ انھیں کے ذریعہ اوپر بھیجی جاتی تھیں۔ جاڑوں کے شروع ہی سے میں نے ان نلکیوں کو کئی جگہ سے باندھ دیا اور پھر میری جڑوں نے زمین سے اوپر بھیجنا بند کر دیا۔ پھر میری وہ پتیاں پیلی پڑنے لگیں جن کو غذا نہیں پہنچتی تھی۔ میں نے بھی سب کا سلسلہ بند کر دیا یہاں تک کہ میرا آنچل اور سب زمین پر گر پڑیں اور میں ننگی ہوگئی۔
میں نے ہر پتی کی جڑ کے منہ پر ایک چھوٹی گرہ باندھ رکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دوسری بہار میں ان میں سے ہر ایک میں کلی کھلاؤں اور ایک ڈال تیار کروں۔ میں ہمیشہ نئے پھلوں کی فکر میں رہا کرتی تھی۔ میں چاہتی تھی اپنی ماں کی طرح دو سال میں پھل دینے لگوں۔
مجھے ٹھیک یاد نہیں ہے کہ میرے بدن کے اوپری حصے میں چار یا پانچ گرہیں تھیں جن کو میں پھل پھول دینے کے قابل سمجھتی تھی۔ مجھے اپنے پھولوں کے بارے میں برابر سوچتے رہنا اچھا لگتا تھا۔
جتنا ہی موسم سرد ہوتا گیا مجھے زیادہ نیند آتی گئی اور اس قدر کہ جس وقت برف زمین پر جم گئی میں تقریباً سو چکی تھی۔

پودا اور صاحب جی نے میرے چاروں طرف ٹاٹ کا ٹکڑا اور کاغذ چپکا رکھا تھا۔ آخر کار
میں بھی ایک نرم و نازک چھال رکھتی تھی اور جاڑوں کے برف کے ڈھکے ہوئے موسم
میں خرگوشوں کے لیے ایک اچھی غذا تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے سردی لگ
جائے۔ اس وقت میں جاڑے میں مجبور تھی کہ میں دوبارہ اگوں اور پھر اوپر آؤں۔

جیسے ہی بہار آئی پہلے تو میری جڑیں سیدھی ہوئیں پھر پیراڈ شکل تازہ دم ہو کر
جاگ پڑا اور میری کونپلیں ہل ڈول کر لہلہانے لگیں۔ جو پانی کہ مجھے زمین سے ملتا تھا
میرے سارے بدن کو نیند سے بیدار کر گیا اور مجھے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں اپنی کونپلوں
میں چھوٹی چھوٹی چپیاں بنا رہی تھی تاکہ جس وقت میری کلیاں کھلیں گی میں ان کو بڑا
اور چوڑا بناؤں گی۔ اب میری کلیاں جو کے برابر یا تھوڑی بڑی ہو چکی تھیں۔ میرے
لیے صرف تین کلیوں سے زیادہ ملکیت نہ تھی ایک چوتھی کلی کو ایک بھنورے نے چونچ
مار کر کھا لیا تھا۔

میں تین پھول کھلا سکتی تھی لیکن اس کے دوران میں نے اندازہ کیا کہ تینوں کو
شگفتالو نہیں بنا سکتی۔ میرا ایک پھول کھلا گیا اور جھڑ گیا۔ دوسرے کو میں نے کچا کر
لیا تھا لیکن بعد میں میں اسے غذا فراہم نہ کر سکی وہ بھی مرجھا گیا اور ہوا نے زمین پر بکھیر
دیا۔ پھر میں نے اپنی ساری طاقت اکٹھا کی تاکہ ایسا بے مثال اور زبردست شگفتالو بنا
دوں تاکہ کوئی دیکھے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں اور جو کوئی کھائے ساری
عمر کسی دوسرے پھل پر اپنا ہونٹ اور دانت نہ لگائے۔

پھول کے چند دن بعد میں نے اپنی پنکھڑیوں کو زمین پر گرا دیا اور اس کی
کٹوری میں میں نے کھانا پہنچانا شروع کر دیا اور بڑھاتی گئی یہاں تک کہ پھول
کی کٹوری ٹوٹ گئی اور میں کٹوری بن گئی۔

میرا شگفتالو ٹھیک میرے سر کے نزدیک پھیلا تھا اس لیے اس اندازے جب سے
وہ کچی کیری بادام کے برابر تھی، مجھے کچھ کم زیادہ جھکا آتی تھی اور میں متوجہ رہتی تھی کہ
اگر میں اپنی پسند کا شگفتالو بڑھاؤں تو مجھے ذرا کر جھکا لینی چاہیے اور ممکن ہے کہ
ٹوٹ بھی جائے لیکن میں بالکل نہیں چاہتی تھی کہ اس بھونڈی پیش آنے والی تکلیف
کے لیے اپنے شگفتالو کو کھلا نہ دوں اور اسے گرا دوں۔ اگر تم صحیح جاننا چاہتے ہو تو

جاؤں کہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگلے سالوں میں تقریباً ہر بوشنقالو پھلوں کا۔ اس لیے ضروری تھا کہ پہلے ہی قدم پر اور پہلے ہی شنقالو میں اپنے سارے امتحانوں سے گزر جاؤں جو سانپ بچوں نے میرے چاروں طرف دفن کر رکھا تھا اب وہ ادھر ادھر پھیل کر زمین کو طاقتور بنا رہا تھا۔ اسی سانپ کی برکت سے میں بے حساب ڈالیوں اور پتوں والی ہو گئی تھی۔

بولادو اور صاحبعلی ان دنوں میرا پتہ لگانے کم آتے تھے۔ سوچتی ہوں کہ اپنے ابا کے ساتھ کھیتوں میں یا کھلیانوں میں فصل کاٹنے یا اناج اگانے جاتے تھے۔ لیکن ایک دن مجھے دیکھنے آئے اور اپنے ہاتھوں کی لاٹھی کو میرے ایک طرف زمین میں گاڑ دیا۔ اور مجھے اس سے باندھ دیا۔ میرے خیال میں وہی دن تھا کہ جب کہ ایک بولادو نے کہا: صاحبعلی!

صاحبعلی بولا: ہاں کہو۔

بولادو بولا: میں یہ کہہ رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کتے کا باپ باغبان ہمارے درخت کو پا جائے۔

صاحبعلی نے کہا: اس کو پا جائے یعنی کیا؟

بولادو کچھ نہیں بولا: صاحبعلی نے کہا: وہ اس قسم کی کوئی بات نہیں کر سکتا ہے۔ درخت ہم نے خود بویا ہے اور بڑا کیا ہے۔ اس کا پھل بھی ہمارا ہے۔

بولادو فکر میں تھا، پھر بولا: زمین تو ہماری چیز نہیں!

صاحبعلی نے کہا: پھر بھی کوئی غلط بات نہیں کر سکے گا، زمین اس آدمی کی ملکیت ہوتی ہے جو اسے بوتا ہے۔ زمین کا یہ چھوٹا ٹکڑا جس پر ہم نے درخت لگایا ہے ہماری چیز ہے۔ بولادو نے ہمت اور جرأت سے کہا: ہاں ہاں ہماری چیز ہے۔ اگر ایسی ویسی بات کرے گا تو ساری باغ میں آگ لگا دیں گے۔

صاحبعلی نے اپنے ننگے سینے پر ایک مکا مارا اور جلتے ہوئے سینے کو دکھاتے ہوئے بولا:

یہ جسم مر جائے گا اگر اس کا مزید ادارس اس کے حلق کے نیچے اترے دوں۔ آگ لگا دیں گے اور بھاگ جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ اگر اس روز پولاد اور صابجعلی نے اپنی کلہاڑیوں سے مجھے سہارا دیا ہوتا تو یقیناً میں اولت میں ٹوٹ جاتی۔ کیونکہ بڑی تیز ہوا چلی تھی اور شاخوں کو چیرتی ہوئی گزر رہی تھی اور میں نے صبح کو دیکھا کہ بادام کے پیڑ کی کچھ ڈالیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور میں اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنے شفتالو کو سخت اور بھاری بناتی جا رہی تھی اور اس کے اندر رنگ اور گودے کو دھوپ کے ذریعے بھرنے کا موقع فراہم کر رہی تھی۔ میری بیٹی مجھ سے چپکی ہوئی میرے جسم سے اسی طرح غذا حاصل کر رہی تھی کہ کبھی میرا جسم دکھنے لگتا تھا لیکن میں اس سے کبھی خفا نہیں ہوئی آخر میں اب ماں بن چکی تھی اور میری اپنی خوبصورت بیٹی تھی۔

صابجعلی اور پولاد میری دیکھ بھال میں اتنا سرگرم تھے کہ انھوں نے باغ کے دوسرے درختوں کو بالکل بھلا دیا تھا اور گذشتہ سال کی طرح میری ماں کے شفتالوؤں کی فکر میں نہیں لگے ہوئے تھے۔ میں خود اپنے کو بھی انھیں کی ایک چیز سمجھتی تھی اور ان کو حق دیتی تھی کہ جس وقت میرا شفتالو بالکل پک جائے اسے توڑیں اور مزہ لے کر کھائیں جس طرح کسی وقت مجھے کھایا تھا۔

بہاروں سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ ایک دن پولاد میرے پاس بہت رنجیدہ آیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ میں ان میں سے صرف ایک کو دیکھ رہی تھی۔ پولاد نے پہلے مجھے پانی دیا پھر گھاس پر بیٹھ گیا اور پھر دھیرے دھیرے مجھ سے اور میرے شفتالو سے بولا: پیارے شفتالو کے پیڑ، میرے خوبصورت شفتالو والے پیڑ کیا ہوا؟ کچھ بھی معلوم ہے کہ آج میں کیوں بالکل اکیلا ہوں؟ ہاں مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ تم نہیں جانتے، صابجعلی مر گیا، اسے سانپ نے کاٹ کھایا۔ جھاڑ پھونک کرنے والی بڑھیا ابھی رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ میرے خیال میں اس سے بھی کچھ بن نہ پڑ رہا تھا۔ جو دوائیں کہ اس نے بتائیں میں اور صابجعلی کے باپ جنگل سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے تھے۔ لیکن پھر بھی صابجعلی اچھا نہ ہوا۔ بیٹے صابجعلی!... آخر مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟

پولاد نے رونا شروع کیا پھر بڑبڑاتا ہوا کہنے لگا: کچھ دن پہلے ظہر کے وقت جب میں جنگل سے لوٹ رہا تھا تو ٹیلے کے اوپر ہم دونوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ہم نے طے کیا کہ

پھولوں سے پوچھا کہ میں کس کی اولاد ہوں۔ شفتالو کا ایک بہترین پودا باغ میں اُگ آیا
تھا جبکہ اس نے کوئی محنت نہیں کی تھی۔ میں بہت خفا تھی کہ آخر کار میں ایک ایسے باغبان
کے ہاتھ لگی جو خود ایک پیسے والے آدمی کا نوکر ہے اور صرف پیسے کے لیے گاؤں کے لوگوں
کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔

دس پندرہ شفتالو پکائے تھے لیکن جب سوچتی تھی کہ میرے شفتالو کن لوگوں کی قسمت
میں ہوں گے، تو میں اپنے آپ کو بُری لگتی تھی۔ مجھے پالا اور رضا جعل نے بڑا کیا تھا اور نصیب
کا ہی حق تھا کہ میرے شفتالو کھائیں۔

ایک روز میرے دل میں یہ خیال آیا اور اسی روز سے میں نے اپنے سارے شفتالو گرانے
شروع کر دیے۔ جب باغبان نے دیکھا کہ میرے بدن میں کوئی شفتالو نہیں رہ گیا تو سوچا
کہ میری جڑ ابھی نہیں ہے۔ زور زور سے کہا، آئندہ سال تیری جگہ بدل دوں گا تاکہ اچھی
طرح پانی پیے اور خوبصورت اور زبردست شفتالو پھلے۔

آئندہ بہار میں جب میں نے اپنی جڑیں جگائیں تو دیکھا کہ سب بکھری ہوئی ہیں اور
بعض تو سوکھ گئی ہیں لیکن پھر بھی پوری جڑیں رہ گئی تھیں، پہلے تو پوری جڑوں کو زمین
میں سمونا شروع کیا پھر نئی جڑیں نکلیں اور میں نے اِدھر اُدھر پھیلا دیں۔ اس وقت جب
کلیاں کھلانے اور کونپلیں اور پنکھڑیاں بنانے کی فکر میں پڑ گئی اور میں نے اپنی اولاد
کو پہچان لیا۔

اس وقت سے آج تک مجھے معلوم نہیں کہ میری زندگی کے کتنے سال بیت چکے ہیں۔
باغبان میرے شفتالوؤں کو نہیں کھلا سکا ہے اور اس کے بعد بھی انہیں کھلا سکے گا۔ میں
اس کا حکم نہیں مانوں گی۔ اب چاہے مجھے اُڑا دے یا آرے سے کاٹ ڈالے یا میری جان لے
ڈالے۔

۱۹ر فروری [illegible]ء
بروز منگل

# سونے اور جاگنے کے چوبیس گھنٹے

عزیز پڑھنے والے بچو!

سونے اور جاگنے کی کہانی میں نے اس لیے نہیں لکھی ہے کہ تم اسے کھیل سمجھو۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ تم اپنے ہم وطن بچوں کو اچھی طرح پہچانو اور سوچو کہ ان کی تکلیف کا علاج کیا ہے؟

اگر میں چاہوں کہ وہ سب کچھ جو میرے اوپر شہر تہران میں بیتا سناؤں تو ایک پوری کتاب کیا کئی کتابیں ہو جائیں گی اور شاید سب کو تھکا بھی دے۔ اس لیے میں صرف آخر کے چوبیس گھنٹوں کا واقعہ بیان کر رہا ہوں کیونکہ سوچتا ہوں کہ وہ تھکا دینے والا نہ ہو۔ البتہ مجبوراً مجھے یہ بھی لکھ دوں کہ میرا اور میرے بابا کا تہران آنا کیسے ہوا؟

کئی مہینے ہو گئے تھے کہ میرے بابا بیمار ہو گئے تھے۔ آخرکار میری اماں، بہن اور بھائیوں کو اپنے ہی شہر میں چھوڑا، میرا ہاتھ پکڑا اور ہم لوگ یہاں آ گئے۔ ہمارے شہر کے کچھ پڑھنے لکھنے والے پہلے ہی سے تہران آ گئے تھے اور کوئی نہ کوئی کام پا گئے تھے۔ ہم لوگ بھی انھیں کے لالچ میں آ گئے تھے۔ مثلاً ہمارے جاننے والوں میں سے ایک کی برف کی دکان تھی، دوسرے پرانے کپڑے اور فرش خریدتا اور بیچتا تھا۔ دوسرا سگریٹ بیچتا تھا۔ میرے بابا نے بھی ایک ہاتھ والا ٹھیلا خریدا اور پھیری والا بن گیا۔ پیاز، آلو، ککڑی اور اسی قسم کی چیزیں گھوم کر بیچتا تھا

ہم ایک لقمہ میں اپنا پیٹ بھرتے تھے اور ایک لقمہ اپنی ماں کے پاس بھی بھیجتے تھے۔ میں بھی کبھی اپنے بابا کے ساتھ گھومتا اور کبھی اکیلا سڑکوں پر سوال کرتا رہتا اور رات میں بابا کے پاس لوٹ آتا تھا۔ کبھی کبھی کپڑے میں بندھا ہوا ایک قرآنی تعویذ، یا فال حافظ اور اسی قسم کی چیزیں بیچتا تھا۔

اب ہم کو اصل مطلب پر آنا چاہیے۔

اس رات میں تھا، قاسم تھا اور زیور ٹکٹ فروش کا بیٹا تھا، احمد حسین تھا اور دو عدد اور بھی تھے جو ایک گھنٹے میں ہی بینک کے چبوترے پر ہمارے دوست ہو گئے تھے۔

ہم چاروں بینک کے چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بات کر رہے تھے کہ کہاں چلا جائے تا کہ تاش کھیلیں کہ وہ دونوں آکر ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ وہ دونوں ہم سب سے بڑے تھے، ایک جس کی ایک آنکھ پھوٹی تھی اور دوسرا اپنے پیروں میں نئے کالے جوتے پہنے تھا لیکن اس کے پینٹ کے سوراخ میں سے اس کی گندی پنڈلی دکھائی دے رہی تھی اور اس کا سر اور چہرہ تو ہم سب سے بھی بڑا تھا۔

ہم چاروں نے نظریں چراتے ہوئے اس کے جوتوں پر نگاہ ڈالنا شروع کیا اور پھر ہم نے اس کا چہرہ بھی دیکھا۔ ہم نے نگاہوں ہی میں ایک دوسرے کو اشارے سے بتایا اسے بچو، متوجہ رہنا کہ ہم ایک جوتا چور کے ساتھ ہیں۔ وہ جب ہماری نگاہوں کی طرف متوجہ ہوا، بولا: کیا بات ہے؟ کیا تم لوگوں نے جوتا نہیں دیکھا ہے؟

اس کا دوست بولا: چھوڑ ان کو لونڈے، کیا نہیں دیکھتا کہ ان کے پیٹ خود ہی باہر نکلے ہیں، ان سب چاروں نے بھلا جوتا کاہے کو دیکھا ہوگا؟

محمود نے کہا: میں تو خود ان کے ننگے پیر دیکھ رہا ہوں پھر بھی میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی ان کے پیروں نے جوتا دیکھا ہے!

اس کا کانا دوست بولا: سب کے سب تیزی کی طرح سرکاری کام کرنے والے باپ نہیں رکھتے ہیں کہ رشوت کی طرح پیسہ خرچ کریں اور اپنے بچوں کے لیے نیا جوتا خرید لیں۔

پھر دونوں مسکرا مسکرا کر ہنسنے لگے۔ ہم چاروں بالکل حیرت زدہ اور فکر...

بھرے تھے۔ احمد حسین نے زیور کے بیٹے کی طرف دیکھا، پھر دونوں نے مل کر قاسم کو گھورا پھر تینوں نے میری طرف دیکھا، کیا کیا جائے؟ یا تو ہم راستہ کا روڑا ہٹا دیں یا پھر ان کو ہنسنے دیں اور اپنی ہار مان لیں؟

میں نے تیز تیز کہا: محمود تو چپ رہ!... تو نے جوتے چرائے ہیں!....

دونوں نے ہنسی ہنسی میں تھوڑا کھینچا تانی کیا۔ کانا اپنے دوسرے ساتھی کو کہنی مارتا ہوا کہہ رہا تھا..... ہا ہا میں نے کہا نہ تھا محمود؟ ہا ہا.... میں نے نہیں کہا۔ ہا ہا ہی ہی، ہا ہا!....

سڑک کے کنارے سب رنگ برنگی موٹریں اور کاریں کھڑی ہوئی تھیں اور ایسی لائن بنا رکھی تھی گویا ہمارے سامنے لوہے کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ ایک ٹیکسی والا جنگ کی جو ٹھیک میرے سامنے تھی روانہ ہوئی اور ایک جگہ خالی ہوئی تا کہ ہم سڑک کے بیچ کا حصہ دیکھ سکیں۔

قسم قسم کی کاریں، ٹیکسیاں اور بسیں سڑک کے بیچ کے حصے کو بھرے ہوئے تھیں قطار باندھے دھیرے دھیرے چل بھی رہی تھیں، اور پوں پوں، پیپ پیپ کی آوازیں نکال رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک، دوسرے کو دھکیل بھی رہی ہیں اور آگے بڑھتی جا رہی تھیں اور ایک دوسرے کو آواز بھی دے رہی تھیں۔ میرے خیال میں تہران دنیا کا مشغول ترین علاقہ ہے اور یہ سڑک تہران شہر کا مصروف ترین حصہ ہے۔

کانے اور اس کے دوست محمود ہنستے ہنستے لوٹے جا رہے تھے میں خدا خدا یاد کر رہا تھا کہ ہمارے بیچ جھگڑا ہو جائے۔ میں نے ایک بڑی دھاک والی سیکھی تھی اور میں چاہتا تھا کہ جیسے بھی جہاں کہیں بھی ہو کسی ایک کو لگا دوں۔ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کاش محمود میرے کان پر ایک تھپڑ مارے پھر میں غصہ ہو جاؤں اور میں اس سے کہوں گا، میرے اوپر ہاتھ اٹھاتا ہے؟ اب آتا ہوں اور تیرا پیٹ چاقو سے پھاڑ رہا ہوں۔ میں نے یہ! اسی ارادے سے میں نے محمود کی ناسکٹ کو جو میرے بغل میں کھڑا ہوا تھا، لپیٹ گیا اور بولا: اگر تو چور نہیں ہے تو بتا کہ ان جوتوں کو کس نے تیرے واسطے خریدا ہے؟

اس بار ہنسی بند ہو گئی۔ محمود نے میرا ہاتھ تیزی سے ہٹا دیا اور بولا: اپنی جگہ بیٹھا رہ بچہ، کچھ اپنی باتوں کا مطلب بھی سمجھتا ہے؟

کانے نے اپنے آپ کو بیچ میں لا ڈالا اور جھگڑا نہ ہونے دیا۔ بولا: اسے چھوڑ محمود! اس رات کے گئے اب جھگڑا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں چھٹنے کا مزہ لینے دے۔
ہم چاروں لڑنے اور لاٹھی چلانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن محمود اور اس کا دوست ٹھیک تفریح اور چھٹنے کے موڈ میں تھے۔
محمود نے مجھ سے کہا: لڑکے کے باپ۔ آج رات ہم لڑائی لڑنا نہیں چاہتے۔ اگر تمھارا لڑنے کا جی چاہتا ہے تو کل رات تک کے لیے انتظار کریں۔
کانا بولا: آج کی رات ہم چاہتے ہیں کہ تھوڑا اسی طرح بولیں ہنسیں۔ اچھا؛ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔
ایک چمکیلی ٹیکسی ہمارے سامنے آکر سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی اور خالی جگہ پھر بھر گئی۔ اس میں سے ایک جوان مرد، عورت اور ایک سفید پلّا اتر کر پیدل چلے۔ جوان ٹھیک احمد حسن کے قد کے برابر تھا۔ سفید پینٹ، موزہ، دو رنگی سینڈل پہنے، بالوں میں کنگھا کیے اور چہرہ پر کریم ملے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں سفید عینک تھی اور دوسرے ہاتھ میں اپنے باپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ پلّے کی زنجیر خانم کے ہاتھ میں تھی جن کے ہاتھ، پیر ننگے اور اونچے ایڑے کی سینڈل پہنے ہوئے تھیں۔ جب ہمارے سامنے سے گزریں تو ان کے سینٹ کی خوشبو ہمارے ناکوں میں آئی۔ کانا نے اپنے پیروں کے نیچے سے چھلکا اٹھایا اور زور سے لڑکے کی گردن پر مارا۔ لڑکے نے مڑ کر ہم لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا: رفتے!...
احمد حسین نے کہا: چلا جا بھاگ جا مالک کے بیٹے۔
میں نے موقع پایا اور کہا: ابھی اگر تیرا پیٹ چاقو سے پھاڑ دوں گا۔
سارے بچے ایک ساتھ ہنس پڑے۔ باپ نے لڑکے کا ہاتھ کھینچا اور ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے جو کہ دوسری طرف چند میٹر کے فاصلہ پر تھا۔
پھر ساری نظریں محمود کے نئے جوتے کی طرف پلٹ آئیں۔ محمود نے دوستانہ انداز میں کہا: جوتا میرے لیے بہت ضروری بھی نہیں ہے۔ اگر پسند ہے تو تمھاری چیز ہے۔
پھر احمد حسین کی طرف مڑا اور بولا: آؤ تم اپنے جوتے اتار اور اپنے پیروں میں

اول ۔

احمد حسین نے محمود کے پیروں پر شبہ کی نگاہ ڈالی اور بولا نہیں۔ محمود نے کہا: کیوں
گھورا جا رہا ہے، نیا جوتا نہیں پہچانتا ہے؟ آؤ بیٹھے۔

اب کی بار محمود اپنی جگہ سے اٹھا اور جا کر محمود کے سامنے جھک گیا تاکہ اس کا
جوتا اتارے، ہم تینوں دیکھ رہے تھے اور کچھ نہیں بول رہے تھے۔ احمد حسین نے محمود
کے پیر زور سے پکڑ لیے اور کھینچا لیکن اس کا ہاتھ پھسل گیا اور پیٹھ کے بل نشیب ہاتھ
پر گر پڑا۔ محمود اور کانے نے اس طرح ہنسنا شروع کیا کہ میں اپنے آپ سے کہنے
لگا کہ ابھی ان کے پیٹ میں درد نہ شروع ہو جائے۔ احمد حسین کے ہاتھ کالے ہو گئے
تھے۔ کانا محمود کی بغل میں بڑی بڑی ہنسی ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا نہیں محمود؟
ہا ہا ہا... نہیں کہا؟.... پھر پھر...

احمد حسین کی پھسلی ہوئی انگلیاں محمود کے پیروں پر دیکھی جاتی تھیں۔ ہم تینوں نے
سمجھ لیا کہ ہم بے وقوف بن گئے ہیں۔ ان دو دوستوں کے بازوؤں کی ہنسی ہم سب کے اندر
بھی داخل ہو گئی تھی، ہم بھی ہنسنے لگے۔ احمد حسین بھی جو غصہ ہو کر لوگوں کے پیروں کے
نیچے سے اٹھ گیا تھا، تھوڑی دیر تک ہمیں دیکھتا رہا پھر وہ خود بھی ہنسنے لگا۔ اب
بے ہنسی کی ہنسی بس ایک پیدل چلنے والوں کا ایک گروہ ہمیں دیکھ رہا تھا اور گزرتا جا رہا
تھا۔ میں جھکا اور محمود کے پیروں کو غور سے دیکھا، جوتا کہاں تھا! صرف اپنے پیروں
رنگ لیا تھا اور اس طرح کہ آدمی سوچتا تھا کہ نیا کالا جوتا پہنا ہے عجیب دھوکے
کی تھی۔

. . . . . . .

محمود نے کہا کہ چھ آدمیوں والی تاش بازی ہو۔

میرے پاس چار ہزار تھے، قاسم نے نہیں بتایا کہ کتنے اس کے پاس تھے۔ وہ
دونوں پانچ ہزار رکھتے تھے، زیور کا لڑکا ایک تومان رکھتا تھا۔ احمد حسین کے پاس
کچھ نہ تھا۔ تھوڑا آگے جا کر ایک بند دکان تھی ہم وہاں گئے اور دکان کے سامنے تاش
بیٹھے۔ شروع کرنے کے لیے ہم نے پانسہ پھینکا۔ پہلے پہل زیور کے لڑکے کا نام
پڑا۔ اس نے تاش پھینکا اور پانچ لایا۔ پھر قاسم کی باری تھی، تاش پھینکا اور چھ لایا۔

ایک قرآن (دس پیسہ کا سکہ) زیور کے لڑکے سے لیا، پھر دوبارہ پھینکا، دو لایا، پھر تماشہ محمود کو دیا، محمود چار لایا، دو قرآن قاسم سے لیے اور خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے بولا: برکت بابا، میری قسمت۔

اس طرح دو دو کر کے ہم تاش پھینکتے اور کھیلتے رہے۔

دو عمدہ خوب صورت لباس پہنے ہوئے جوان داہنے ہاتھ کی طرف سے چلے آ رہے تھے۔ احمد حسین سامنے دوڑا اور عاجزی کی: دس پیسے... جناب دس پیسے دیجیے ..... آپ کو خدا....

مردوں میں سے ایک نے احمد حسین کو چپت مارا اور بھگا دیا۔ احمد حسین دوڑا اور ان کے سامنے آ گیا اور منت کی جناب ایک قرآن دیجیے ... ایک قرآن تو کچھ نہیں آپ کو خدا...

جس وقت ہمارے سامنے سے جا رہے تھے، جوان آدمی نے احمد حسین کی گردن پیچھے سے پکڑی اور اٹھا کر سڑک کے کنارے پر لگی ہوئی ریلنگ پر لٹکا دیا۔ احمد حسین کا سر سڑک کی طرف تھا اور پیر فٹ پاتھ کی طرف لٹک رہے تھے۔ احمد حسین نے ہاتھ پیر مارے یہاں تک کہ اس کا پیر زمین پر ٹک گیا اور وہیں پر نالے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ دو جوان لڑکیاں ایک جوان آدمی کے ساتھ ہنستی ہوئی بائیں طرف سے چلی آ رہی تھیں۔ لڑکیوں نے خوب صورت بلاؤز پہن رکھے تھے اور لڑکے کے دونوں طرف چل رہی تھیں۔ احمد حسین سامنے دوڑا اور ایک لڑکی سے منت کرنے لگا۔

جناب خدا کی قسم آپ پر، صرف ایک قرآن دیجیے .... بھوکا ہوں۔ ایک قرآن تو کچھ بھی نہیں ہے ..... آپ پر خدا کی قسم جناب، ایک قرآن.....

لڑکی نے کوئی توجہ نہ دی۔ احمد حسین پھر گڑگڑایا۔ لڑکی نے اپنے پرس سے پیسہ نکالا اور احمد حسین کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ احمد حسین خوش خوش لوٹا اور مجھ سے کہا: میں بھی پھینکوں گا۔

زیور کا بیٹا بولا: تیرے پیسے کہاں ہیں؟

احمد حسین نے اپنی مٹھی کھولی اور دکھایا، بیس کا دو سکہ، جس کے ہاتھ پر تھا قاسم نے کہا پھر بھیک مانگی تو نے؟

اور چاہا احمد حسین کو مارے مگر محمود نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نہیں چھوڑا۔ احمد حسین نے کچھ نہیں کہا۔ اپنے لیے جگہ بنائی اور بیٹھ گیا۔ میں اٹھ گیا اور بولا: میں فقیروں کے ساتھ تاش نہیں کھیلتا رہوں۔

اب میرے پاس صرف ایک قرانی تھا۔ اپنے چار ہزار میں سے تین ہزار ہار چکا تھا۔ محمود بھی جو زیادہ ہار چکا تھا بولا: اب تاش کھیلنا ختم ہوتا ہے۔ ہم دیوار کے پاس چل کر اور کچھ کھیلیں گے۔

قاسم نے مجھ سے کہا: لطیف، پھر اپنی ان باتوں سے کھیل نہ بگاڑ۔

پھر سب سے بولا: کون تاش پھینک رہا ہے؟

کاظم نے کہا: تو خود اکیلا پھینک۔ ہم دیوار کے پاس کھیلنے جا رہے ہیں۔

زیور کے لڑکے نے قاسم کی طرف اشارہ کیا اور بولا: اس کے ساتھ تاش بازی کوئی فائدہ نہیں رکھتی ہے۔ شیر بازی یا خط بازی کریں گے۔

احمد حسین نے کہا: ٹھیک ہے۔

محمود نے کہا: نہیں، دیوار کے نیچے۔

سڑک خالی ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے کی کئی دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ کھیل کرنے کے لیے ہم میں سے ہر ایک نے دس کا قرانی سنگ نہر کے کنارے سے دیوار کی جڑ میں پھینکا۔ ابھی سکے دیوار کی جڑ میں ہی تھے کہ احمد حسین چلایا۔ پولیس۔

پولیس والا ہاتھوں میں ڈنڈا لیے ہمارے دو تین قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں اور احمد حسین اور کاظم کل بھاگے۔ محمود اور زیور کا بیٹا بھی ہم دونوں کے پیچھے بھاگے۔ قاسم نے چاہا کہ پیچھے دیوار کے نیچے سے جمع کرے کہ پولیس آن پہنچی۔ قاسم نے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر ایسی چیخ ماری اور دوڑتا ہوا بھاگا۔ پولیس نے اس کے پیچھے سے آواز لگائی۔ جواری حرامزادو...... کیا تمہارے گھر اور گھر والے نہیں ہیں؟ مگر کیا تمہارے باپ اور ماں نہیں ہیں؟

پھر جھک کر سکے جمع کیے اور واپس چلا گیا۔

جب میں چوراہے سے گزرا تو دیکھا کہ میں اکیلا ہوں۔ سڑک کے اس پار کے چلو کباب والے کی دکان بند ہو چکی تھی۔ میں نے دیر کر دی تھی۔ جب چلو کباب والے کا

شاگرد لوہے کا دروازہ آدھا بند کرتا ہوا ابھرتا تو میرا وقت اپنے ابا کے پاس لوٹ جانے کا ہوتا تھا۔ میں سڑکوں اور چوراستوں سے تیزی سے گزر رہا تھا اور اپنے آپ سے کہہ رہا تھا اب تو میرے باپ سو چکے ہوں گے کاش کہ میرا انتظار کر رہے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب تو وہ یقیناً سو چکے ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کھلونے بیچنے کی دکان" کیا ہے۔ وہ بھی اس وقت بند ہے۔ اس وقت رات گئے کون کھلونے خریدنے کی ہمت کرے گا۔ میرے ہونٹ کو بھی دکان میں بند کر دیا ہے اور دکان کا دروازہ بھی بند کر دیا ہے اور چلے گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کاش کہ میں اپنے اونٹ کے ساتھ کھیل سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اسے بھول نہ جائے کہ کل رات مجھے کیا کہا گیا تھا۔ اگر میرے پاس نہیں آیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں یقیناً آئے گا۔ اس نے خود ہی کہا کہ کل رات میں آؤں گا، مجھ پر سوار ہونا۔ ہم تہران گھومنے چلیں گے۔ اونٹ کی سواری کا بھی مزہ رہتی ہے! ۔ ۔ ۔ ۔

اچانک ایک ہارن کی آواز بلند ہوئی اور میں چونک گیا اور اس طرح کہ مجھے خیال ہوا کہ میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھا ہوں۔ جب ہوش میں آیا تو سمجھا کہ میں سڑک کے بیچ میں کسی چیز سے ٹکرا گیا ہوں لیکن مجھے کچھ ہوا نہیں۔ میں اپنے ہاتھ کی کلائی کو مل رہا تھا کہ ایک صاحب نے اپنی کار سے سر باہر نکالا اور چلایا، رفتار تو جا کار کے سامنے سے! تو پتھر کا بت تو نہیں ہے۔

میں اچانک ہوش میں آ گیا۔ ایک بڑھیا بکری کی طرح کار کے ہینڈل پر جھکی بیٹھی تھی ایک بڑا کتا بھی اس کے بغل میں اکڑوں بیٹھا ہوا باہر دیکھ رہا تھا۔ کتے کے گلے کا پٹا چمک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا حال یہ ہو گیا کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر فوراً یہ کام نہیں کروں گا مثال کے طور پر اگر کار کے شیشے نہ توڑ دوں، تو غصہ سے پاگل ہو جاؤں گا اور کسی وقت اپنا دماغ قابو میں نہ رکھ سکوں گا۔

بڑھیا عورت نے دو ایک بار ہارن بجایا اور دوبارہ بولی : کیا بہرہ ہے لڑکے؟ بھاگ کار کے سامنے سے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دو ایک کاریں اور آ گئیں اور ہماری بغل سے گزر گئیں۔ بڑھیا نے اپنا سر دوبارہ باہر نکالا، اور چاہا کہ کچھ کہے کہ میں نے زیادہ ساتھوک اس کے اوپر تھوک دیا اور کچھ سوئی

موٹی گالیاں اسے دیں اور تیزی سے رفوچکر ہو گیا۔

میں تھکن سے چور چلا اور ایک بند دکان کے زینے پر بیٹھ گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

دکان کا لوہے کا گیٹ سوراخوں والا تھا اور اندر کے حصے میں روشنی جل رہی تھی اور شیشے کے پیچھے قسم قسم کے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن میرا بابا کہہ رہا تھا کہ ہم اپنی دس دن کی مزدوری لگا کر بھی ان جوتوں میں سے ایک جوڑی تک نہیں خرید سکتے۔

میں نے اپنا سر در دروازے پر ٹکا لیا اور پاؤں پھیلا دیے۔ میرے ہاتھ کی کلائی ابھی تک درد کر رہی تھی اور میرا پیٹ خالی تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ اپنے آپ سے کہا: "آج کی رات بھی بھوکا سونا چاہیے کاش بابا نے میرے لیے کوئی چیز بچا رکھی ہو۔۔۔" اچانک مجھے یاد آیا کہ آج کی رات میرا اونٹ آئے گا اور مجھے بٹھا کر گھمانے لے جائے گا۔ اپنی جگہ سے اچھلا اور تیز چل پڑا۔ کھلونوں کی دکان بند تھی لیکن کھلونوں کا شور اور ہنگامہ لوہے کے دروازے کے پیچھے سے سنائی دے رہا تھا۔ ایک مسافروں سے بھری ٹرین چھک چھک کر رہی تھی اور سیٹی دے رہی تھی۔ ایک موٹا کالا ریچھ جھک کے بیٹھا تھا اور اپنی ہیں اور گڑگڑ کی آواز نکال کر خوبصورت اور پیاری پیاری گڑیوں کو ڈرا رہا تھا۔ بندر ایک کونے سے دوسرے کونے میں کود رہے تھے اور کبھی اونٹ کی دم پکڑ کر لٹک بھی جاتے تھے، روز اونٹ بلبلاتا تھا اور بہت اضانا کہتا تھا۔ لمبے کانوں والا گدھا اپنے دانت بھینچ رہا تھا اور ڈھینچوں ڈھینچوں کر رہا تھا اور ریچھ کے بچوں کو اور گڑیوں کو اپنی پیٹھ پر سواری کرا رہا تھا اور ادھر ادھر پھلانگیں مار رہا تھا۔ اونٹ نے اپنا کان دیوار گھڑی کی ٹک ٹک پر لگا رکھا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو وقت دے رکھا ہوگا۔ جہاز اور بجلی کا پنکھا ہوا میں پرواز کر رہے تھے کچھوے اپنے خول میں گردن چھپائے ہوئے تھے۔ کتیاں اپنے پلوں کو دودھ پلا رہی تھیں، بلی دبے پاؤں ٹوکری میں سے مرغی کا انڈا چرا رہی تھی، خرگوش اپنے سامنے ایک جال کے بنے ہوئے کٹہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ کالا بندر میرے جیسے کو جو ہمیشہ شیشے کی دیوار کے پیچھے رکھا رہتا تھا اپنے موٹے ہونٹوں پر مل رہا تھا اور طرح طرح کی خوبصورت آوازیں نکال رہا تھا۔ بسیں اور سواریاں گڑیوں کو سواری

کراہ رہی تھیں اور چکر کاٹ رہی تھیں۔ ٹینک، بندوقیں اور پستول اور میگزینیں تیزی سے گولیاں برسا رہے تھے۔ خرگوشوں کے سفید بچے بڑی بڑی بالیاں لیے ہوئے چھپ رہے تھے۔ سب سے زیادہ اہم میرا اونٹ تھا جو اگر تھوڑی سی بھی حرکت کرتا تو سارا معاملہ درہم برہم ہو جاتا۔ اتنا زبردست تھا کہ اب بیٹھنے کے پیچھے نہیں دکھایا جاتا تھا اور سارا دن فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا رہتا تھا اور تماشا دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت بھی کھڑا ہوا تھا اور دیوار گھڑی کی ٹک ٹک اور اپنی گردن کی گھنٹی کو ٹن ٹن بجا رہا تھا۔ سناٹے کے پیچھے جا رہا تھا اور دیوار گھڑی کی ٹک ٹک دیکھ رہا تھا۔ چھوٹے سفید اونٹوں کی ایک قطار کٹہرے سے آواز لگا رہی تھی، "اماں اگر تم بازار جا رہی ہو ہم لوگ بھی تمہارے ساتھ چلیں گے، اچھا؟"

چاہا کہ اپنے اونٹ سے دو دو باتیں کروں گا لیکن کتنا ہی آواز لگائی اس نے نہیں سنا۔ مجبوراً میں نے دروازہ پر کئی لاتیں ماریں کہ شاید دوسرے خاموش ہو جائیں لیکن اسی وقت کسی نے میرا کان پکڑا اور کہا "کیا پاگل ہو گیا ہے لونڈے؟ جا اور سو جا"

اب کھڑے ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ میں نے اپنے کو پولیس کے ہاتھ سے چھڑایا اور دوڑا تاکہ اب اس سے زیادہ دیر نہ کروں۔

جس وقت اپنے بابا کے پاس پہنچا، پوری سڑک خاموش اور اجاڑ تھی۔ اکّا دکّا ٹیکسی آتی اور چلی جا رہی تھی۔ میرا بابا اپنے ٹھیلے کے اوپر سویا ہوا تھا اور اگر میں بھی اس کے ساتھ سونا چاہتا تو اسے جگانے پر مجبور تھا تاکہ وہ اپنا پیر ایک طرف پسارے اور مجھے جگہ دے۔ ہمارے ٹھیلے کے علاوہ دوسرے ٹھیلے بھی شہر کے کنارے یا دیوار سے لگے ہوئے کھڑے تھے جن پر لوگ میرے بابا کی طرح سو رہے تھے۔ چند آدمی اسی طرح دیوار کے کنارے فرش پر سو رہے تھے۔ یہ چوراہا تھا اور ہمارے شہر والوں میں سے ایک نے یہیں اپنی برف بیچنے کی دکان کھول رکھی تھی۔ مجھے زور کی نیند آ رہی تھی اپنے ٹھیلے کے نیچے گرا اور گہری نیند سو گیا۔

ٹننگ، ٹرننگ!.... ٹرننگ!....

اور لطیف تو کہاں ہے؟ لطیف کیوں جواب نہیں دے رہا ہے؟ کیوں نہیں آتا ہے کہ ہم جائیں اور کھیلیں۔

ٹھیک! ... ٹھیک! .... ٹھیک! ....

پیارے لطیف، میری آواز سن رہے ہو؟ میں اونٹ ہوں ..... میں آگیا ہوں تمہیں لینے
چلیں اور آؤ میرے اوپر سوار ہو جاؤ چلیں۔

جب اونٹ باڑے کے اندر آیا میں اپنے پلنگ سے اٹھا اور اونٹ کی پیٹھ
پر بیٹھا ہوا بولا: میں تو تیری پیٹھ پر اس وقت سوار ہوں کیوں چلا رہا ہے؟

اونٹ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا اور تھوڑی سی گھاس اپنے منہ میں ڈالی۔ تھوڑی سی
مجھے دی اور ہم چل پڑے۔ تھوڑا ہی چلے تھے کہ اونٹ نے کہا: میں تیرا ہنجو بھی لایا
ہوں۔ بجاؤ تو ہم سنیں۔

میں نے اپنا خوبصورت ہنجو اونٹ سے لیا اور پوری قوت سے اس کو بجانے
لگا۔ اونٹ نے بھی اپنی پھولی بڑی گھنٹیوں کی جھنک، ٹنانگ، ٹونگ، ٹنانگ میرے
ساز میں ملا دی۔ اونٹ نے اپنا سر میری طرف کیا اور بولا: لطیف، رات کا کھانا
کھایا ہے؟

میں نے جواب دیا نہیں، میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔

اونٹ بولا: میں ہم پہلے چل کر رات کا کھانا کھائیں گے۔

اسی وقت سفید خرگوش ایک درخت پر سے نیچے کودا اور بولا: پیارے اونٹ
آج ہم لوگ رات کا کھانا محل میں کھائیں گے۔ میں چل کر دوسروں کو اطلاع دیتا
ہوں اور تم لوگ تو خود ہی جا رہے ہو۔

خرگوش نے بال کو جیسے اب تک چبا رہا تھا، شہر میں پھینکا اور چھلانگ لگا کر
ہم سے دور ہو گیا۔ اونٹ نے کہا: محل کا مطلب جانتے ہو کیا ہے؟

میں نے کہا: میرے خیال میں: ریسٹ ہاؤس۔

اونٹ نے کہا: ریسٹ ہاؤس نہیں۔ لکھ پتی لوگ اچھی آب و ہوا والی جگہوں پر اپنے
لیے شاندار کوٹھیاں اور عمارتیں بناتے ہیں اور جب کبھی ان کی طبیعت چاہی، وہاں آرام
اور تفریح کرنے چلے جاتے ہیں۔ ایسے گھروں کو بنگلہ یا ولا کہتے ہیں۔ اور یہ کوٹھیاں
تیرنے کے تالاب، فوارے، چمن اور سبزہ زاروں سے سجی ہوتی ہیں۔ پھر اور سے
مالی، نوکر اور نوکرانیاں بھی ہوتے ہیں۔ اور بعض لکھ پتی تو باہر کے ملکوں میں بھی

کوٹھیاں رکھتے ہیں جیسے سوئزرلینڈ اور فرانس میں۔ اس وقت ہم آخری تہران کی ایک کوٹھی چلا رہے ہیں تا کہ گرمی سے آرام پائیں۔

اونٹ نے یہ کہا اور معلوم ہوتا تھا کہ پر لگا کر کھلا ہے، پرندوں کی طرح ہوا میں اونچا ہو گیا۔ ہمارے پیروں کے نیچے خوبصورت اور صاف مکان کھڑے تھے۔ فضا میں دھوئیں اور گندگی کی جھلک بھی نہیں تھی۔ گھر اور گلیاں اس طرح تھیں کہ مجھے خیال ہوا خواب دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے اونٹ سے کہا۔ اونٹ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم تہران شہر سے باہر نکل گئے ہوں۔

اونٹ نے کہا: تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟

میں بولا: آخر اس طرف بالکل ہی دھواں اور گندگی نہیں ہے۔ گھر بھی سارے کے سارے بڑے بڑے گلدستوں کی طرح ہیں۔

اونٹ ہنسا اور بولا: ٹھیک کہتے ہو پیارے عزیز، تہران کے دو حصے ہیں اور ہر حصہ اپنی جگہ ایک الگ چیز ہے۔ دکھن اور اُتّر۔ دکھن دھوئیں اور بدبو سے بھرپور لیکن اُتّر صاف ہے اس لیے کہ ساری کارخانے اسی طرف ہیں، سارے اینٹ پکانے والے بھٹے اس کے دوسری طرف ہیں، سارے ٹرک اور بسیں اسی طرف آتے جاتے ہیں، دکھن سے زیادہ تر گلیاں اور سڑکیں کچی ہیں۔ اُتری حصہ کی ساری گندگی اور نالیوں کا پانی دکھن کی طرف بہہ کر آتا ہے۔ مختصر دکھنی حصہ بھوکے اور بے حیثیت انسانوں کا علاقہ ہے اور اتّر امیروں اور افسروں کا علاقہ ہے۔ تو نے کبھی عصیر آباد، نازی آباد، حاجی عبدالحمود مارگ کے سنگ مرمر کی بنی ہوئی دس منزلہ عمارتیں دیکھی ہیں۔ یہ اونچی اونچی عمارتیں ہیں جن کے نیچے امیروں اور افسروں کے مارکیٹ ہیں اور جن کے خریدار آرام دہ گاڑیوں والے اور ہر مہینہ پانچ ہزار کی قیمت کا قالین رکھنے والے ہیں۔

میں نے پوچھا: جنوب کے علاقہ میں اس طرح کی چیزیں نہیں دکھائی دیتی ہیں؟ اس جگہ کوئی سواری نہیں رکھتا ہے لیکن بہت سارے لوگ بھٹہ ٹھیلا رکھتے ہیں اور گڑھوں میں سوتے ہیں۔

میں اتنا بھوکا تھا کہ معلوم ہو رہا تھا کہ میرے پیٹ میں سوراخ ہو گیا ہے۔

ہمارے پیروں کے نیچے ایک بہت بڑا باغ تھا اور طرح طرح کے رنگین قمقموں
سے روشن، ٹھنڈا، سبز درختوں اور پھولوں سے بھرا ہوا۔ بیچ میں گلدستہ کی طرح
ایک عمارت تھی اور اس کے چند گز کے فاصلہ پر ایک بڑا شاہانے کا تالاب، نقرئی
اور لال مچھلیوں کا ڈھیر، اور اس کے چاروں طرف میزیں، کرسیاں، پھول اور کلیاں
ہی کلیاں تھیں۔ میزوں پر ہر قسم کے کھانوں کی ایک دنیا رکھی ہوئی تھی جس کی مہک
آدمی کو پاگل بنا دیتی تھی۔

اونٹ بولا: ہم نیچے چلیں۔ رات کا کھانا تیار ہے۔

میں نے کہا: باغ کا مالک کہاں ہے؟

اونٹ بولا: اس کی فکر نہ کرو۔ تہ میں پڑا ہاتھ باندھے سو رہا ہے۔

اونٹ تالاب کے کنارے سنگ مرمر کے چبوترے پر بیٹھ گیا اور میں کود کر نیچے
آگیا۔ خرگوش بھی موجود تھا۔ میرا ہاتھ پکڑا اور لے جا کر ایک میز پر بٹھا دیا۔ تھوڑی
دیر بعد مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ گڑیاں ٹیکسیوں کے ذریعہ، ایک گروہ ہوائی جہاز
اور ریل کی پٹری کے ذریعہ، پھلانگتا ہوا مچھر، اونٹ کی دم سے لٹکتے ہوئے کچھوے،
اچھلتے کودتے بندر اور خرگوش دوڑتے دوڑتے آ گئے۔ عجیب و غریب شور شرابے
کی دعوت تھی اور ایسا کھانا کہ جس کی خیالی خوشبو آدمی کے منہ سے پانی نکال رہی تھی
تلی ہوئی مچھلیاں، بھنا ہوا مرغ، شامی کباب، پلاؤ اور طرح طرح کے سالن اور بہت
بہت سے دوسرے، نہ جانے کون کون سے کھانے کہ جنہیں جانتا ہی نہ تھا کہ کون
کون سے کھانے ہیں۔ پھل بھی وہ سب جن کا جی چاہے کھائے، بہت زیادہ تھے۔
ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔

اونٹ تالاب کے کنارے وہیں کھڑا رہا اور سر اور گردن کے اشارے سے
سب کو خاموش کیا اور بولا: سب چھوٹے بڑے خوش آمدید، محبت لائے ہو۔ لیکن
میں چاہتا تھا کہ تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ کس کے لیے اور کیوں
اس طرح کی دعوت کا انتظام کیا گیا ہے۔

مچھر بولا: لطیف کے لیے ہم چاہتے تھے کہ وہ بھی خوب پیٹ بھر کر ایک بار
کھائے۔ کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ ریچھ نے سگریٹ کی چسکی لے کر کہا: آخر لطیف ہم لوگوں

کو دیکھنے اس قدر آتا رہتا ہے کیونکہ ہم سب اس کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔

چیتا بولا: اور نہیں تو کیا، جس طرح بھی لطیف کا دل چاہے ہم اس کی چیز ہیں اسی طرح ہمارا دل بھی چاہتا ہے کہ ہم اس کی ملکیت ہونے پر فخر کریں۔

شیر نے کہا: ہاں۔ لکھ پتیوں کے لڑکوں کا دل ہم سے جلد بھر جاتا ہے۔ ان کے والدین ہر روز ان کے لیے نئے نئے کھلونے خریدتے ہیں۔ اس وقت وہ ہمارے ساتھ دو ایک بار کھیلنے کے بعد ان کا دل ہم سے اکتا جاتا ہے اور دوبارہ ہمارے ساتھ کھیلتے ہیں اور ہمیں پھینک دیتے ہیں کہ ہم پڑے سڑتے رہیں۔ اسی لیے میں بولا تھا اگر تم میں سے ہر ایک میری چیز ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کبھی تم سے نہیں اکتاؤں گا میں ہمیشہ تمہارے ساتھ کھیلوں گا اور تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

کھلونوں نے ایک ساتھ کہا: ہم جانتے ہیں، ہم تم کو اچھی طرح پہچانتے ہیں لیکن ہم تیری ملکیت نہیں ہو سکتے۔ ہمیں بہت مہنگا بیچتے ہیں۔

پھر ان میں سے ایک نے کہا: میں نہیں سوچتا ہوں کہ تیرے بابا کی ایک مہینہ کی تنخواہ یا آمدنی تک بھی ہم میں سے کسی ایک کو خریدنے کے لیے کافی ہو سکے۔

اونٹ نے پھر سب کو چپ کرایا اور بولا: ہم اپنے مطلب کی بات کریں تو سب کی باتیں صحیح ہیں لیکن ہم نے آج رات کی دعوت ایک غیر ضروری کام کے لیے کی جس کا ذکر تم لوگوں نے نہیں کیا۔

میں پھر بولنے لگا: میں خود ہی جانتا ہوں کہ تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ تم سب نے چاہا کہ مجھے کھول کر دیکھ کہ سارے لوگ تیرے بابا اور تیری طرح بھوکے سڑک کے کنارے نہیں سوتے ہیں۔

کچھ مرد اور عورتیں ایک میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور جلدی جلدی کھانا کھا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے ملازم اور نوکرانیاں تھے۔ میں نے بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے معدہ میں سوراخ تھا کیونکہ میں جتنا ہی کھاتا جاتا تھا سیر نہیں ہوتا تھا اور میرا پیٹ برابر قرقر، گھڑبڑ کر رہا تھا۔ اس طرح جب میں بھوکا رہا کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں کہ میرا پیٹ نہیں بھر رہا ہے؟ ایک ہاتھ میں نے اپنی آنکھوں پر پھیرا۔ دونوں ابھی

طرح کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میں سو رہا ہوں؟" نہیں سو نہیں رہا ہوں۔ جب آدمی سوجاتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلی نہیں رہتی ہیں اور کسی طرف دیکھتا نہیں ہے۔ بس پھر میرا پیٹ کیوں نہیں بھر رہا ہے۔ میں کیوں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا کلیجہ کھرچ رہا ہے۔

اب میں عمارت کے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا اور اس کی دیواروں کے ٹوٹے پھوٹے پتھروں پر اپنا ہاتھ پھیر رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کہاں سے مٹی اور گرد چلی آ رہی تھی اور میرے چہرے پر بیٹھ رہی تھی۔ اب میں زمین کے اوپر تھا اور خیال کر رہا تھا کہ یہ گرد اور مٹی دنیا سے ہے اور زمین کے پچھلے کسی ذرے پر میری ناک اور منہ میں اتنی مٹی بھر گئی کہ مجھے چھینک آگئی: آچھیں۔

. . . . .

میں نے اپنے آپ سے کہا: کیا ہوا؟ میں کہاں ہوں؟

اور پھر کا جہاز دھڑک میرے منہ کے سامنے سے ہٹا اور ننھا ہاتھ کی گرد اور مٹی میرے چہرے پر بھر گئی۔

پھر میں نے خود سے کہا: کیا ہوا؟ میں کس جگہ ہوں؟ کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟

لیکن میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنے بابا کا ہاتھ تھیلا دیکھا پھر ٹیکسیوں کی قطار ٹوٹ گئی اور پھر سب کے جانے میں میری آنکھیں چھ لاکھ کی تمام عمارتوں پر پڑی۔ بس میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ سپیرا اب میرے سامنے سے جا چکا تھا لیکن اسی طرح دھول میں اٹا رہا تھا اور ننھا ہاتھ پر لالٹین بناتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا: بس وہ سب میں نے خواب میں دیکھا؟ مگر...

اور نہیں تو کیا خواب دیکھا۔ نہیں!... نہیں!... نہیں...

جھنگی لوٹا اور میری طرف دیکھا۔ میرے بابا تھیلے سے جھکے اور بولے لطیف سو رہا ہے۔ میں نے کہا: نہیں!... نہیں!...

میرے بابا نے کہا: اگر سو نہیں رہا ہے تو چلا کیوں رہا ہے: آ ادھر میرے پاس۔

میں اوپر چلا گیا۔ میرے بابا نے اپنی بانہیں میرے سر کے نیچے رکھ دیں لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے پیٹ میں چوہے کود رہے تھے اور میرا پیٹ ٹھیک میری پیٹھ سے چپکا ہوا تھا۔ جب بابا نے دیکھا کہ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے تو کہا: رات دیر میں آیا۔ میں بھی تھکا تھا جلد سو گیا۔

میں نے کہا: دو سواریوں میں ٹکر ہو گئی تھی میں دیکھنے کھڑا ہو گیا اور دیر ہو گئی۔

پھر میں نے کہا: بابا۔ کیا اونٹ بات کر سکتا ہے اور اڑ بھی سکتا ہے۔

میرے بابا بولے: ہاں۔ اونٹ کے پر تو نہیں ہیں۔

بابا نے پوچھا: بیٹا تجھے کیا ہو گیا ہے۔ ہر صبح جب سو کر اٹھتا ہے تو اونٹ کا ذکر کرتا ہے۔

میں جو کہ کچھ اور سوچ رہا تھا بولا: پیسہ والا ہونا بھی اچھی چیز ہے بابا کیا نہیں ہے؟ آدمی جو چاہے کھا سکتا ہے جو دل چاہے رکھ سکتا ہے۔ ہاں نا بابا۔ میرے بابا نے کہا۔ ناشکر نہ کر بیٹا۔ اللہ خود ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو مالدار بنائے اور کس کو نادار۔

میرا بابا ہمیشہ یہی باتیں کہا کرتا تھا۔

جب موسم اور روشن ہو گیا تو بابا نے اپنا پھٹا جوتا سر کے نیچے سے اٹھا کر پہنا پھر ہم لوگ ٹھیلے سے نیچے اتر آئے۔ بابا بولا۔ کل میں آڑوؤں کو ڈھک نہیں سکا تھا آدھے سے زیادہ سڑ گئے یا پچک کر نہ بک سکے۔

میں نے پوچھا: کیا کوئی دوسرا سودا لانا چاہتے تھے؟

بابا کچھ نہیں بولا۔ ٹھیلے کا تالا کھولا اور دو بھری ہوئی بوریاں نکال کر ٹھیلے پر الٹ دیں۔ میں نے بھی ترازو اور باٹ نکالا اور ٹھیلے پر رکھا۔ ہم چل پڑے۔

میرے بابا نے کہا: چلتے ہیں شوربہ کھانے۔

جس روز صبح میرے بابا یہی کہا کرتے تھے "چلیں شوربہ کھانے" تو میں سمجھ جاتا تھا کہ انھوں نے رات کا کھانا نہیں کھایا ہے۔

بھنگی نے سڑک کو آخری سرے تک جھاڑو پھیر کر لائنیں بنا دی تھیں۔ ہم لوگ ایک شہر کے علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ بنڈا شوربہ فروش ہمیشہ کی طرح منہ

کے کنارے، سڑک کے پیچھے بیٹھا تھا اور شوربے کا ڈونگا اس کے سامنے رکھا تھا اور انگیٹھی پر رکھا ہوا دیگ کھل کھل کر پک رہا تھا۔ تین عدد مرد اور عورت خریدار اس کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور المونیم کے پیالوں میں اپنا شوربہ کھا رہے تھے عورت ٹکٹ بیچنے والی تھی اور زیور ٹکٹ بیچنے والی کی طرح برقعہ پہنے تھی اور ٹکٹوں کی گڈی اپنے پیٹ، ٹانگوں اور گھٹنے برقعے کے بیچ رکھے ہوئے تھی۔

میرے بابا نے بوڑھے مرد سے خیر و عافیت پوچھی اور پھر ہم دونوں بیٹھ گئے دو پیالہ شوربہ اور آدھی آدھی روٹیوں سے کھایا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بابا نے مجھے دو قرآن کے سکّے دیئے اور بولا: میں پھیری لگانے جا رہا ہوں، ظہر کے وقت لوٹ کر یہیں آجانا ہم لوگ دن کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔

. . . . .

پہلا جس آدمی سے میری ملاقات ہوئی وہ زیور ٹکٹ فروش کا بیٹا تھا ایک لڑکی کا سا منہ لئے رکھا تھا اور برابر کچھ چبا رہا تھا۔ جناب ایک عدد ٹکٹ خرید لیجیے۔ انشاءاللہ لاٹری آپ کے نام نکلے گی۔

اس آدمی نے زبردستی زیور کے بیٹے سے پیچھا چھڑایا اور چلا گیا۔ زیور کے بیٹے نے منہ ہی منہ میں گالیاں دیں اور چلا ہی جانا چاہتا تھا کہ میں نے اسے آواز دی اور کہا: کیا اسے پہچانتے ہو!

زیور کے لڑکے نے کہا: اس کا موڈ خراب تھا گویا اپنی بیوی سے لڑ کر آیا ہو۔

ہم دونوں چل پڑے۔ زیور کا بیٹا دس بیس ٹکٹ کی گڈی لیے لوگوں کے سامنے آجاتا اور برابر کہتا رہتا: جناب ٹکٹ ۔ ۔ ۔ ۔ جناب ٹکٹ! ۔ ۔ ۔

زیور کا بیٹا ہر ٹکٹ بیچنے کے عوض اپنی اماں سے ایک قرآن لیتا تھا اور جب اپنا روزانہ کا جیب خرچ پورا کر لیتا تھا پھر اور ٹکٹ نہیں بیچتا تھا۔ کھیلنے نکل جاتا اور گھومتا، بیٹھا جاتا اور بار بیٹ کرتا رہتا۔ ہم سے زیادہ مالدار تھا۔ ظہر کے وقت اس کی عادت یہ تھی کہ نہر کے کنارے یا پل کے نیچے ایک دو گھنٹہ سو لیتا تھا۔ صبح بالکل سویرے اٹھ جاتا تھا اور اپنی اماں سے دس بیس عدد ٹکٹ لے لیتا تھا اور

نکل پڑتا تھا تاکہ سویرے سویرے خریداروں کو موقع نہ دے تاکہ ظہر سے قبل سارا کام پورا کرلے۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ظہر کے بعد بھی ٹکٹ بیچ کر اپنا آرام حرام کرے۔

خیابان نادری تک نیلور کے بیٹے نے تین عدد ٹکٹ بیچ ڈالے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو بولا: میں اب یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔

دکانیں اکا دکا کھلی تھیں۔ کھلونے بیچنے کی دکان بند تھی۔ میرا ارنٹ بھی نیا تھا کے کنارے نہیں آیا تھا۔ میرا دل نہیں چاہا کہ دروازہ کھٹکھٹاؤں اور اپنے صبح والے خواب کا مزہ خراب کروں۔ میں آگے چل کر چلا گیا۔ سڑک سارے اسکولی بچوں سے بھری پڑی تھی۔ بہر ٹیلیسی کے اندر اسکول کے دو ایک لڑکے اپنے بابا یا اماں کی بغل میں بیٹھے ہوئے تھے اور مدرسہ جا رہے تھے۔

ایسے وقت میں، میں صرف احمد حسین کو پا سکتا تھا تاکہ اکیلا نہ رہوں۔ پھر میں کئی سڑکوں سے گزرا یہاں تک کہ ان سڑکوں کے قریب پہنچ گیا جن پر گندگی، بدبو اور دھوئیں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بچے اور بڑے سبھی صاف ستھرے لباس میں تھے۔ ان سب کے چہرے چماچم چمک رہے تھے۔ بچیاں اور عورتیں رنگ برنگ پھولوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ دھوپ میں دکانیں اور گھر آئینہ بنے ہوئے تھے۔ جب کبھی میں اس محلہ سے گزرا کرتا تھا تو سوچتا تھا کہ میں سینما ہال میں بیٹھا فلم دیکھ رہا ہوں۔ میری کبھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسے اونچے اور صاف ستھرے گھروں میں کس کس طرح کے کھانے کھاتے ہوں گے، کیسے سوتے ہوں گے، کیسی باتیں کرتے ہیں اور قسم قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ کیا تم اپنے آپ سمجھ سکتے ہو کہ تم اپنی ماں کے پیٹ میں زندہ کیسے تھے؟ مثلاً یہ کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے آپ کو اپنی اماں کے پیٹ میں دیکھ سکو گے کہ کس طرح کھانا کھاتے ہیں۔ نہیں تمہیں نہیں سمجھ سکتے۔ میں بھی تمہاری طرح تھا۔ میں بالکل یہ نہیں سوچ سکتا تھا۔

ایک دکان کے سامنے تین لڑکے ہاتھوں میں اسکول کا بستہ لیے کھڑے تھے اور شیشہ کے پیچھے کی چیزیں دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ان کے کنگھا کیے بالوں میں خوب اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ بے اختیار میں نے ان میں سے ایک کی گردن کے قریب جا کر سونگھا۔ بچوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا، مجھے گھورا اور نفرت

کی نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے دوری اختیار کر لی اور چلے گئے۔ میں نے دور سے سنا
کہ ان میں سے ایک یہ کہہ رہا تھا "اس کے جسم سے کتنی خراب بدبو آ رہی ہے"!

میں نے صرف اتنا موقع نکالا کر اپنے چہرے کو دکان کے شوکیس کے شیشہ میں
دیکھ سکوں۔ میرے سر کے بال اتنے لمبے اور بکھرے ہوئے تھے کہ میرے کانوں کو چھپا
لیا تھا۔ گویا میں نے بالوں کی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ میرا کھردرا موٹا کرتا مٹ میلا اور
کالے رنگ کا ہو گیا تھا اور اس کے پھٹے ہوئے گریبان سے میرا میلا اور سوکھا
جسم جھانک رہا تھا۔ میرے پیر ننگے، میلے تھے اور کوے پھٹے ہوئے تھے۔ میرا دل
چاہتا تھا کہ لوگوں رئیس زادوں کے سر پھوڑ دوں۔

کیا یہ ماں کا قصور تھا کہ میں اس قسم کی زندگی گزار رہا تھا؟

ایک آدمی دکان کے اندر سے باہر آیا اور ہاتھ ہلا کر مجھے بھگایا اور بولا: جاؤ بھئی!
ابھی تو صبح صبح ہم نے بونی بھی نہیں کی ہے کہ تجھے کچھ دیں۔

میں بالکل نہیں ہلا اور کچھ بولا بھی نہیں۔ آدمی نے دوبارہ مجھے ہاتھ کے اشارے
سے منع کیا اور کہا: جا بھاگ جا، عجیب ڈھیٹ لڑکا ہے!

میں پھر بھی نہ ہٹا اور بولا: میں فقیر نہیں ہوں۔

مرد بولا: معاف کرو میاں صاحبزادے کیا کام ہے؟

میں نے کہا: کوئی کام نہیں ہے۔ بس تماشا کرنا چاہتا ہوں۔

اور میں چل پڑا۔ آدمی دکان کے اندر چلا گیا۔ نہر کی تہ میں ایک پتھر کا ٹکڑا چمک
رہا تھا۔ میں نے اب دیر نہیں کی۔ پتھر کا ٹکڑا اٹھایا اور اپنے ہاتھوں کی پوری
قوت سے شوکیس کے شیشے پر دے مارا۔ شیشہ کی آواز آئی اور چکنا چور ہو گیا۔
شیشہ ٹوٹنے کی آواز نے گویا میرے دل پر سے بڑا بوجھ اٹھا لیا ہو اور پھر میرے
دو پیر تھے۔ میں نے دو پیر قرض لیے اور پھر بھاگتا ہی رہا! مجھے یاد نہیں کہ
میں نے کتنی سڑکیں طے کر ڈالیں۔ اسی وقت مجھے احمد حسین مل گیا اور جان گیا کہ
میں دکان سے بہت دور آگے نکل آیا ہوں۔

احمد حسین ہمیشہ کی طرح لڑکیوں کے اسکول کے سامنے ادھر ادھر دوڑ رہا
اور ٹیکسیوں سے اترنے والے بچوں اور سواریوں سے بھیک مانگتا رہتا۔ روزانہ

صبح احمد حسین کا کام یہی تھا۔ میں آخر وقت تک نہ سمجھا کہ احمد حسین کس کے ساتھ رہتا ہے لیکن قاسم کہا کرتا تھا کہ احمد حسین کی صرف ایک بڑھیا دادی ہے اور وہ بھی بھیک مانگتی ہے۔ احمد حسین خود بھی کچھ نہیں مانگتا تھا۔

جب اسکول کا گھنٹہ بجایا گیا اور بچے کلاس میں گئے تو ہم چل پڑے۔ احمد حسین نے کہا: آج آمدنی اچھی نہیں ہوئی۔ سب کہتے ہیں کہ روزگار کی تنگی ہے۔

میں نے پوچھا کہ ہم کو کہاں جانا ہے؟

احمد حسین بولا: بس ہم لوگ اسی طرح راستہ چلتے رہیں گے۔

میں نے کہا: اسی طرح نہیں، چلیں قاسم کو ڈھونڈیں ایک ایک پیالہ دہی پئیں۔

خیابان تیس گز کے کنارے قاسم ایک تغاری میں دہی کا ایک پیالہ بیچا کرتا تھا اور ہم جب کبھی اس سے ملنے جاتے تھے تو ہر ایک کو ایک ایک پیالہ دہی مفت میں پلاتا تھا۔ قاسم کا باپ خیابان حاجی عبدالمحمود میں پرانے کپڑے خریدتا اور بیچتا تھا۔ ایک کرتا پندرہ ہزار کا اور دو جانگیے بیس ہزار، کوٹ، پینٹ سات آٹھ تومان کا۔ خیابان حاجی عبدالمحمود ایک موڑ کے بعد قاسم کے کاروبار والی جگہ سے مل جاتا تھا۔ سڑک کے در و دیوار پرانے اور گودڑ کپڑوں سے بھرے پڑے تھے جن کے ایک کنارے پر ان کے دکان دار کھڑے رہتے تھے اور خریداروں کو پکارتے رہتے تھے۔ قاسم کے باپ کی دکان چھوٹی سی تھی اور رات کو اپنی اماں اور باپ کے ساتھ تینوں سوتے تھے۔ ان کا کوئی اور گھر بھی نہ تھا۔ قاسم کی ماں صبح سے شام تک پھٹے اور پرانے کپڑوں کو جنہیں قاسم کا باپ یہاں وہاں سے خریدا کرتا تھا، دکان کے اندر یا خیابان تیس میٹری کی نہر پر دھوتی اور سکھا کر پیوند لگایا کرتی تھی۔ خیابان حاجی عبدالمحمود کچا تھا اور پانی کی نہر اس میں نہیں تھی اور کوئی کار وہاں سے نہیں گزرتی تھی۔

میں اور احمد حسین دو ایک گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد قاسم کے کام کرنے کی جگہ پہنچ گئے۔ قاسم وہاں نہیں تھا۔ ہم لوگ خیابان حاجی عبدالمحمود کے یہاں گئے۔ قاسم کے باپ نے بتایا کہ قاسم اپنی اماں کو ہسپتال لے گیا ہے۔ قاسم کی اماں کو ہمیشہ یا تو پیروں کے درد کی شکایت رہتی یا پھر پیٹ میں درد کی تکلیف رہتی۔

. . . . .

ظہر کے قریب میں، احمد حسین اور زبیدہ کا بیٹا تینوں خیابان نادری کی نہر کے کنارے اونٹ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور بیج کھا رہے تھے اور اونٹ کی قیمت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ آخر میں ہم نے طے کیا کہ دکان کے اندر چلیں اور دکان دار سے پوچھیں۔ دکان دار نے یہ سوچ کر کہ ہم بھکاری ہیں، دروازہ سے نہیں نکالا اور بولا باہر چلے جاؤ ہمارے پاس کھلا پیسہ نہیں ہے۔

میں نے کہا، جناب ہم پیسہ نہیں مانگ رہے ہیں۔ اونٹ کتنے میں بیچ رہے ہیں؟

اور میں نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ دکان دار نے تعجب سے کہا:

اونٹ؟

احمد حسین اور قاسم میرے پیچھے سے بولے: اور نہیں تو کیا، کتنے میں بیچتے ہو؟

دکان دار نے کہا، باہر جاؤ، بابا اونٹ بکاؤ نہیں ہے۔

جلے بھنے دماغ کو لیے ہم دکان سے باہر آئے۔ معلوم ہوتا ہے اگر بکاؤ تھا بھی تو ہم اتنا روپیہ نہیں رکھتے تھے کہ ہم ادا کر دیں، اونٹ لے لیں اور گھر لے جائیں۔

اونٹ اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑا ہوا تھا ہم لوگ سوچتے تھے کہ ہم تینوں کو ایک ساتھ بھاگ سکتا ہے اور اسے ذرہ برابر بھی تکلیف نہ ہوگی۔ احمد حسین کا ہاتھ بڑی مشکل سے اونٹ تک پہنچا تھا۔ زبیدہ کا لڑکا بھی اپنے ہاتھوں کا امتحان کرنا چاہتا تھا کہ اتنی دیر میں دکان دار آ گیا اور قاسم کا کان اینٹھتا ہوا بولا۔ گدھا کیا دیکھتا نہیں کہ لکھا ہوا ہے "ہاتھ نہ لگایئے"۔

اور اپنے ہاتھ سے کاغذ کے ایک پرچہ کی طرف اشارہ کیا جو اونٹ کے گلے میں لٹکا ہوا تھا اور اس پر کوئی چیز لکھی ہوئی تھی لیکن ہم میں سے کوئی اس کے مطلب کو نہیں سمجھ رہا تھا۔ ہم وہاں سے اٹھے اور بیج چبانے اور ٹہلنے کا پروگرام بنایا۔

تھوڑی دیر بعد زبیدہ کا لڑکا بولا کہ اسے نیند آ رہی ہے اور نہر کے کنارے پل کے نیچے ایک خالی جگہ تلاش کی اور سو گیا۔ میں نے اور احمد حسین نے پارک شہر جانے کا ارادہ کیا۔ موسم گرم اور گھٹن والا تھا۔ ہم کو اتنا پسینہ نکل آیا تھا کہ بس نہ پوچھو۔ ہم میں سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کاش اس وقت اپنی اماں کے پاس ہوتا۔ مجھے اپنا پردیس بری طرح کھل رہا تھا۔

پارک شہر کے گیٹ پر احمد حسین نے دو قران دیے اور انڈے کا سینڈوچ خریدا
اور میرے لیے بھی ایک نوال کھا لینے کے لیے پکار دیا۔ پھر ہمیشہ کی طرح ہم نہر میں نہانے
کے لیے اتر گئے۔ کچھ اور دوسرے بچے بھی ہم سے اونچی جگہ پر پہلے سے نہا رہے تھے۔
اور ایک دوسرے کے اوپر پانی اچھال رہے تھے۔ میں اور احمد حسین پانی کے اوپر چت
لیٹے تیرتے رہے گئے۔ اپنا سر اور بدن دھویا اور دھل دھلا کر اجلے اور ہلکے ہو گئے۔ پارک
کا رکھوالا ادھر آتا ہوا ادھر آیا اور ہم سب نکل کر بھاگے اور جا کر دھوپ میں ریت پر بیٹھ
گئے۔ میں اور احمد حسین ریت کے ذریعے اونٹ کی شکل بنا رہے تھے کہ میرے سر پر میرے
بابا کی پکار سنائی دی۔ احمد حسین مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اور بابا گھر کو اور پھر راستے
کی دکان پر گئے اور جا کر دن کا کھانا کھایا۔ بابا نے دیکھا کہ میں کچھ بولتا نہیں اور کچھ
سوچ رہا ہوں تو کہا: لطیف کیا بات ہے؟ کیا تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟

میں بولا: کوئی بات نہیں ہے۔

ہم پارک شہر کے درختوں کے سائے میں آئے تاکہ سو لیں۔ میرے والد نے
دیکھا کہ میں اس کروٹ اور اس کروٹ ہو رہا ہوں اور سو نہیں رہا ہوں تو بولے:
لطیف! کیا جھگڑا لڑائی کی ہے؟ کسی نے تجھے کچھ کہا ہے؟ آخر مجھے بتاؤ
کیا ہوا؟

میں بالکل بولنا نہیں چاہتا تھا۔ اچانک سر اٹھا کر پھر بولے غصہ ہو کر۔ میرا
دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اپنی ماں کی آواز سنوں اس سے لپٹ جاؤں اور اسے پیار
کروں۔ میں نے یکایک رونا شروع کر دیا اور اپنا سر بابا کے سینے میں چھپا لیا۔ بابا
گھبرا گیا اور مجھے لپٹا لیا اور مجھے اپنا کر رونے دیا۔ لیکن پھر بھی میں نے بابا سے
کچھ نہ کہا۔ صرف اتنا بتایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ماں کے پاس ہوتا۔ پھر مجھے نیند آ گئی
اور جیسے ہی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بابا میرے سرہانے بیٹھے ہیں اور میری ٹانگیں اپنے
سینے سے لگائے ہیں اور غور سے قبلے کے ایک گروہ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں پہلو
کو جھٹک کر کھڑا ہوا اور بولا بابا! بابا نے مجھے دیکھا، اپنا ہاتھ میرے بالوں پر پھیرا
اور کہا: جاگ گئے میرے پیارے؟
میں نے سر ہلا کر کہا: ہاں!

بابا بولے: کل ہم اپنے شہر لوٹ رہے ہیں، تمہاری اماں کے پاس چلیں گے۔ مگر
کون کا: ہم وہیں رہیں گے اور آدھی ہی روٹی کھائیں گے اور نہ جوان ہیں جو کچھ بھی ہوگا
یہاں سے اچھا ہی ہوگا کہ ہم یہاں بے یار و مددگار ہیں، یہ سب وہاں بھی ہوگا۔
راستے میں پارک سے گیرج تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں خوش ہوں یا نہیں۔
میرا دل اونٹ سے دور ہونا نہیں چاہتا تھا اگر میں اونٹ کو اپنے ساتھ لے جا سکتا تو
شاید پھر رنجیدہ نہ ہوتا۔

ہم دونوں نے جا کر بس کا ٹکٹ خریدا پھر اسی سڑک سے اپنے ٹھیلے کی طرف چل
پڑے۔ میرے بابا چاہتے تھے کہ جیسے تیسے اپنا ٹھیلا شام تک بیچ دیں۔ میرا دل چاہتا
تھا کہ جس طرح ممکن ہو ایک بار اونٹ کو جی بھر کر دیکھ لوں۔ ہم نے طے کیا کہ رات کو
جا کر گیرج کے آس پاس سو لیں گے۔ میرے بابا مجھے اکیلے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے
لیکن میں نے کہا اگر جی چاہتا ہے کہ تھوڑا ادھر ادھر گھوم آؤں کہ دل بہل جائے۔

* * * *

دن ڈھلنے کا وقت تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر تک کھڑا ہوا اونٹ کو دیکھتا
رہا کہ ایک کھلے ہڈ کی ٹیکسی آئی اور میرے اور اونٹ کے پاس کھڑی ہوگئی۔ ٹیکسی میں
ایک آدمی اور صاف ستھری چھوٹی سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی کی آنکھ اونٹ پر لگی
ہوئی تھی اور خوشی سے چمکا رہی تھی۔ میرے دل کو محسوس ہوا کہ غالباً وہ اونٹ کو خریدیں
گے اور لے جائیں گے۔ لڑکی اپنے پاپا کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ رہی تھی اور کہہ رہی تھی
جلدی پاپا! ابھی کوئی آکر خرید لے گا۔

باپ بیٹی دکان میں داخل ہونے والے ہی تھے کہ دیکھا میں سامنے کھڑا ہوں اور
راستہ رکا ہوا ہے۔ مجھے معلوم نہیں میرا کیا حال تھا۔ میں ڈر رہا تھا؟ کیا مجھے رونا آ رہا
ہے؟ کیا کسی چیز کا رنج کر رہا تھا۔ نہ جانے میرا حال کیا تھا۔ میں ڈر رہا تھا جانتا ہوں
کہ میں نے باپ اور بیٹی کا راستہ روک لیا تھا اور برابر کہے جا رہا تھا۔ جناب!
اونٹ بکاؤ نہیں ہے۔ صبح اس نے خود مجھ سے کہا تھا، یقین کیجئے بکاؤ نہیں
ہے۔ آدمی نے مجھے زور سے ایک طرف دھکا دیا اور بولا: راستہ کیوں روک رکھا
ہے لڑکے۔ الگ ہٹ جا۔

اور دونوں دکان میں داخل ہوئے۔ آدمی نے دکان دار سے بات کرنا شروع کیا۔
لڑکی برابر مڑ مڑ کر اونٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسا خوش تھی کہ آدمی سوچے گا کہ زندگی
بھر اسے کوئی غم اور دکھ نہیں ملا ہے۔ میری زبان گویا گونگی ہو گئی تھی اور میرے
پیر بے حرکت تھے، دکان کے دروازہ پر کھڑا ہوا تھا اور اندر جھانک رہا تھا۔
بندر، اونٹ کے بچے، بھالو، خرگوش اور دوسرے حیوان مجھے گھور رہے تھے
اور میں سوچ رہا تھا ان کا دل میرے حال پر کڑھ رہا ہے۔

باپ اور بیٹی دکان سے باہر آ رہے تھے۔ باپ نے دو تومان کا ایک سکہ
میری طرف بڑھایا۔ میں نے اپنا ہاتھ پیٹھ پر رکھ لیا اور اس کے چہرہ کو غور سے دیکھا۔ نہ
جانے میں نے اسے کس طرح سے دیکھا تھا کہ جلدی سے سکہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور
چلا گیا۔ پھر دکان کے مالک نے مجھے دکان کے دروازہ پر سے بھگا دیا۔ دکان کے دو
مزدور اندر سے باہر آئے اور اونٹ کی طرف گئے۔ لڑکی کار ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی
اور اونٹ کو اس شوق سے دیکھ رہی تھی کہ گویا اپنی آنکھیں اس پر قربان کر دے
گی۔ جب مزدوروں نے اونٹ کو فرش سے اٹھایا، میں بے اختیار سامنے دوڑ کر
آ گیا اور اونٹ کے پیر پکڑ لیے اور فریاد کی کہ اونٹ میرا ہے کہاں لے جا رہے ہو،
میں نہیں لے جانے دوں گا۔

مزدوروں میں سے ایک نے کہا: لڑکے کنارے ہٹ جا۔ کیا پاگل ہو گیا ہے!
لڑکی کے باپ نے دکان دار سے پوچھا: کیا فقیر ہے؟
لوگ تماشا دیکھنے اکٹھا ہو گئے تھے۔ میں اونٹ کا پیر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ناچار
مزدور اونٹ کو زمین پر دوبارہ رکھنے پر مجبور ہو گئے تاکہ پہلے مجھے ہٹا دیں۔ میں نے
ٹیکسی کے اندر سے لڑکی کی آواز سنی جو اپنے باپ سے کہہ رہی تھی: پاپا اسے اونٹ
کو پھر پکڑنے اور چومنے کا موقع دیجیے۔

باپ ٹیکسی میں جا کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اونٹ کو اوپر والے حصے پر رکھ دیا
گیا، ٹیکسی اسٹارٹ ہونے ہی والی تھی کہ میں اپنے کو چھڑا کر ٹیکسی کی طرف دوڑ پڑا۔
دونوں ہاتھوں سے ٹیکسی سے لپٹ گیا اور چیخا: میرا اونٹ کہاں لیے جا رہے ہو، میں
اپنا اونٹ چاہتا ہوں۔

# محبّت کا افسانہ

سہیلا کے لیے ناچیز تحفہ!
اس پیار کے لیے جو وہ بچوں
سے رکھتی تھی۔۔

بہرام

کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جس کی عمر چھ سال کی تھی۔ اس لڑکی کی بہت سی کنیزیں اور خدمتگار تھیں۔ اس کا ایک نوکر بھی تھا، اس سے عمر میں کچھ بڑا اور اس کا نام قوچ علی تھا۔ کھاتے وقت اگر لڑکی کا رومال بھی زمین پر گر جاتا تو قوچ علی اسے اٹھا کر دے دیتا۔ کھیلتے وقت اگر گیند دور جاتا تو قوچ علی لا کر اسے دیتا۔ کبھی کبھی بادشاہزادی کا دل لاکھوں کھلونوں کے کھیل سے اکتا جاتا تو گلی ڈنڈا کھیلنے کی آرزو کرتی تھی۔ شاہزادی کا گلی ڈنڈا بھی سونے چاندی کا تھا۔

جب پہلی بار شہزادی نے گلی ڈنڈا کھیلنے کا اظہار کیا تو بادشاہ نے شہر کے سارے سناروں کو جمع کیا اور حکم کیا کہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر سونے چاندی کا ایک جوڑا گلی ڈنڈا بن کر حاضر ہو جانا چاہیے۔ یہ گلی ڈنڈا لاکھوں روپیہ سے زیادہ خرچ برداشت کر کے بنا اور اسی کے باعث ایک سنار بھی مار ڈالا گیا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ ایک ضروری کام کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتا ہے۔ سنار خود اپنی بچی کے لیے ایک ایئر رنگ بنانے میں لگا ہوا تھا۔

جب کبھی شاہزادی گلی ڈنڈا کھیلنے کی آرزو کرتی، قوچ علی اس سے تھوڑی دوری پر کھڑا ہو جاتا اور منتظر رہتا۔ بادشاہزادی چاندی کی چھوٹی سی گلی زمین پر رکھتی اور سونے کے بڑے ڈنڈے سے اس پر مارتی

دور اسے ہوا میں اچھال دیتی۔ تو پچ علی کی ڈیوٹی تھی کہ دوڑ کر گلی کو اٹھائے اور پھینکے پھر لڑکی اسے فضا میں اچھال کر اس سے اور زیادہ دور پھینک دیتی۔ تو پچ علی دوبارہ دوڑتا۔ اسے اٹھاتا اور لڑکی کی طرف پھینکتا۔ جب لڑکی تھک جاتی تو تو پچ علی جاکر لونڈیوں اور باندیوں کو خبر کرتا، وہ آتیں اور رتھ پر لڑکی کو سوار کرا کے لے جاتیں اور محل پہنچا دیتیں۔ تو پچ علی بھی شاہی خزانہ دار کے پاس جاکر کھیلوں کے انچارج کو خبر کرتا تاکہ گلی ڈنڈا اٹھا کر لاکھوں کھلونوں والے سٹور روم میں رکھ دے۔ پھر اسی طرح تو پچ علی لباسوں کے شاہی نگران کے پاس جاکر اطلاع کرتا کہ وہ شاہ زادی کے کھانے کا لباس لے آئے اور کھیل کا لباس لیجا کر اس کی جگہ پر رکھ دے۔

تو پچ علی پھر لڑکی کے مخصوص باورچی کے پاس جاکر خبر کرتا تھا کہ لڑکی کے لیے گلی ڈنڈا کھیلنے کے بعد والا کھانا لے جائے۔ بادشاہ زادی ہر کھیل کے بعد ایک خاص غذا کھاتی تھی۔

تو پچ علی ہمیشہ انھیں کاموں میں لگا رہتا تھا۔ جس وقت لڑکی سوتی تھی اس کی ڈیوٹی تھی کہ دروازے کے باہر پہرا دے تاکہ نوکر چاکر اور ملازمائیں جاتی رہیں کہ شاہ زادی سو رہی ہے اور وہ کچھ نہ پوچھیں اور نہ کچھ بولیں۔

بادشاہ زادی جو حکم دیتی تو پچ علی انتہائی خوشی سے انجام دیتا اور یہ کام اتنی خوبی سے کرتا تھا کہ بادشاہ زادی نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

تو پچ علی شاہ زادی کا عاشق تھا۔ بالکل صاف ستھری محبت کرتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کام میں کوئی برائی اور خرابی نہیں تھی۔ اسی لیے ایک دن اس نے اپنے دل کا راز لڑکی سے کہہ دیا۔

اس روز لڑکی باغ میں تتلی پکڑ رہی تھی، تو پچ علی بھی درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا اور تماشا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کوئی تتلی اڑ کر درخت کے

اور یہ بیٹھ جاتی تو اس پر چڑھ کر تتلی کو اڑانا اس کا کام تھا۔ ایک بار لڑکی نے ایک بڑا اسکلاد دیکھا۔ تورج علی کو بلایا اور کہا: تورج علی یہاں آ اسے تو پکڑ میں اس سے ڈرتی ہوں۔

تورج علی تیزی سے دوڑا ٹڈے کو پکڑا اور جالدار ٹوکری میں ڈال دیا، جس وقت اپنا سر اٹھایا تو دیکھا کہ شہزادی اس کے بالکل سامنے کھڑی ہے، سادگی سے بولا: شہزادی صاحبہ، میں آپ کا عاشق ہوں، میری آرزو ہے کہ جب ہم دونوں بڑے ہو جائیں تو شادی کر لیں۔

لیکن ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ شہزادی نے ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا اور چلا کر بولی: بے ماں باپ کے لڑکے نوکر: تجھ کو میرے عاشق ہونے کی ہمت کیسے ہوئی؟ کیا تجھے یاد نہیں میں ایک شہزادی ہوں اور تو میرا ملازم ہے تو تو میرے کتے کی چوکیداری کے لائق بھی نہیں ہے، کتے کا پلا، بھاگ جا میری آنکھوں کے سامنے سے!... جا میری کنیزوں سے کہہ آئیں اور مجھے لے جائیں۔ مجھے بھی نکال دیں کیونکہ اب میری آنکھیں تجھ جیسے گندے کو دیکھنا نہیں چاہتیں۔

تورج علی نے جا کر کنیزوں کو خبر کی، وہ دوڑتی ہوئی آئیں تو دیکھا کہ شاہزادی بیہوش پڑی ہے۔ تورج علی پر برس پڑیں کہ تو نے شاہزادی سے کیا کہہ دیا؟ تورج علی نے کہا: میں نے اسے کچھ نہیں کہا، خود ہی غصہ ہوئی مجھے مارا اور بیہوش ہو گئی۔ میں کس کی قسم کھاؤں!

لیکن کون اعتبار کرتا تھا۔ عرق گلاب اور شربت لائے اور لڑکی کو ہوش میں لے آئے۔ اسے رتھ پر لٹایا اور اس کے محل لے گئے۔ بادشاہ کی بیٹی نے حکم دیا: میرے باپ سے کہو اس نمک حرام نوکر کی گوشمالی کریں اور کتے کی طرح اسے محل سے باہر نکال دیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی گندی آنکھیں مجھے دیکھیں۔

بادشاہ نے حکم دیا اور تورج علی کو اسی لمحہ کتے کی طرح باہر نکال دیا۔ بادشاہ کی لڑکی چند روز بعد بیمار پڑی اور روزانہ کئی عدد حکیم اس کے

سرہانے کھڑے رہتے تھے۔ آخر کار اس نے خود ہی کہا کہ اب وہ اچھی ہو گئی ہے اور حکیموں کو رخصت کر دیا۔

۲

سال پر سال گزرتے جا رہے تھے اور بادشاہ زادی روز بروز اور ہر سال پہلے سے زیادہ گھمنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ کسی کو کتے کے برابر نہیں سمجھتی تھی اور جب سترہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو حکم دیا کہ کسی کو حق نہیں کہ اس کی طرف دیکھے اور اس کے پاک جسم کو اپنی نگاہوں سے گندہ کرے اگر کوئی نوکر وں اور نوکرانیوں میں سے غلطی سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا تو اسے ڈنڈے کھانے پڑتے اور اگر وہ گستاخی کرتا اور کچھ تو اسے کہتا زندہ بھوکے بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیتے اور بادشاہ زادی اپنے باغ میں ان کا تماشا دیکھتی رہتی۔ بادشاہ اپنی بیٹی کے ان کارناموں پر اسے شاباشی دیتا اور فخر کرتا۔ ہمیشہ اپنی بیٹی سے کہا کرتا تھا۔ میری بیٹی تو میری راہ پر چلنا چاہتی ہے۔ میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔

شاہ زادی ایسی ہو گئی تھی کہ باغ میں ہمیشہ اکیلی گھوما کرتی تھی اور کسی سے بولتی نہیں تھی۔ کہا کرتی تھی کہ کوئی مجھ سے بات کرنے کے قابل نہیں ہے۔ باغ کے بیچ دو عدد بڑے تالاب بنوا دیے گئے تھے جن میں سے ایک تازہ دودھ سے بھرا ہوتا اور دوسرا گلاب کے عرق اور گلاب اور چنبیلی کے عطر سے لبالب۔ تھا۔ روز ان باندیوں کی ڈیوٹی تھی کہ ایک مقررہ وقت پر اپنا سر جھکائے ہوئے تالاب کے کنارے تک آئیں تاکہ شہزادی دودھ کے تالاب سے نکل کر گلاب اور عطر والے تالاب میں چلی جائے اور اپنے آپ کو تولیے میں لپیٹے۔ نوکرانیوں کو اس کے جسم کو چھونے کا حق نہیں تھا یہاں تک کہ اگر کسی کی انگلی سے اس کی کھال یا بال چھو جاتا تو اسی روز جلادوں کے سپرد کر دیا جاتا تاکہ اس کی انگلی یا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

شاہ زادی دوسروں کو اپنے سے اس قدر دور کرتی تھی کہ بالکل

نتارہ جاتی اور نہیں جانتی تھی کہ وقت کس طرح گزارے۔ تتلی پکڑنے،
پھول توڑنے، دودھ اور عرق گلاب میں نہانے، کھیلنے، کھانے پینے اور
بہروپیوں کے تماشے سے بھی سیر ہو چکی تھی۔ مجبوراً زیادہ اوقات سوتی
رہتی اور قوچ علی کو بھی خواب میں دیکھتی۔ قوچ علی آتا کہ بادشاہزادی
کے ساتھ کھیلے۔ لڑکی پہلے تو خوشحال ہو جاتی اچانک اسے یاد آجاتا کہ
بادشاہزادی ہے اور دوسروں سے فرق رکھتی ہے اس وقت تن
جاتی اور قوچ علی کو دور ہٹا دیتی۔ لیکن قوچ علی کھیل نہ چھوڑنا چاہتا
تھا اس کا ہاتھ پکڑے رہے لڑکی طاقت سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔
لیکن آخر ہاتھ چھوڑ دیتی اور قوچ علی اس کا ہاتھ پکڑے رہتا اور پھر
دونوں کھیلنا، کودنا اور تتلی پکڑنا شروع کر دیتے۔ کھیل کے دوران
قوچ علی کہتا تھا شہزادی صاحبہ، میں آپ کا عاشق ہوں۔ میری آرزو
ہے کہ جب میں آپ کی طرح بڑا ہو جاؤں تو ہم دونوں شادی کر لیں۔
یہاں پھر شہزادی کو یاد آجاتا کہ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور قوچ
علی کو تھپڑ مارتی اور فریاد کرتی اور چلاتی۔ قوچ علی کو جلادوں کے
سپرد کر دیتی اور اچانک اپنے چلانے اور چیخنے ہی سے نیند سے جاگ
پڑتی۔

ہمیشہ یہی خواب دیکھا کرتی اور کسی کو خواب میں کھیلتا نہیں دیکھتی
اب بھی قوچ علی کو اس عمر کا اور اسی بچپن کے حال میں دیکھتی۔
شاہزادی کے لیے بہت سے شاہزادے بھی تھے، کئی شہزادے
دور دراز کے ملکوں سے پیغام لے کر آئے تھے لیکن اس نے بغیر دیکھے
سب کو لوٹا دیا تھا کہ میں سوائے اپنے کسی کو پسند نہیں کرتی ہوں۔

۳

ایک روز شاہزادی تالاب میں نہا رہی تھی۔ ایک کبوتر تالاب
کے کنارے انار کے پیڑ پر آکر بیٹھ گیا اور بولا: اے حسین لڑکی!

تیرا بدن کتنا خوبصورت ہے میں عاشق ہو گیا ہوں، میری تمنا یہ ہے کہ تم دودھ کے اندر سے باہر آؤ تاکہ تمہیں دیکھوں۔

شاہزادی بولی: اے گندے پرندے میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ یہاں سے چلا جا، میں ایک شہزادی ہوں کوئی مجھے دیکھنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔ کوئی مجھ سے بات کرنے کے لائق نہیں۔

کبوتر ہنسا اور بولا: اے خوبصورت لڑکی، مجھے معلوم ہے کہ بہت زمانہ ہو گیا تیرا کوئی ساتھی نہیں ہے...

شاہزادی بھول گئی کہ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور اچانک نرم ہو گئی اور بولی: اے اچھے کبوتر دوست، میری خواہش ہے کہ تو مجھے نہ دیکھ، اچھا نہیں ہے۔

کبوتر بولا: اے حسین شاہزادی، یہ میرا اپنا بس نہیں ہے کہ تجھے نہ دیکھوں۔ تم مجھے پسند ہو۔

لڑکی بولی: اے اچھے کبوتر دوست، میں ایک کبوتر کی دوست نہیں ہو سکتی۔ اگر واقعی تو میرا سچا اور صحیح دوست ہے تو اپنے اصل بھیس میں آ جا تاکہ تجھے دیکھوں۔

کبوتر نے کہا: اے خوبصورت لڑکی، میرا دل مطمئن نہیں ہے کہ تو میری دوستی قبول کرے گی، کوئی چیز رہن رکھ تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے اور میں بھیس بدل دوں۔

لڑکی نے کہا: اے اچھی باتوں والے کبوتر، جو کچھ چاہتا ہے کہہ دے میں دوں گی۔

کبوتر بولا: اے خوبصورت لڑکی، اپنی نیند مجھے دے دے۔

لڑکی بولی: اے اچھے کبوتر، میری نیند تیرے کس کام کی!

کبوتر بولا: اے اچھی لڑکی۔ بعد میں دیکھے گی کہ تیری نیند میرے کس کام آئے گی۔

لڑکی بولی: اے دل بہلانے والے کبوتر، میری نیند تیرا مال۔

اسی وقت لڑکی کے نوکرانی کے پیروں کی چاپ سنائی دی جو تولیہ ہاتھوں میں لیے اپنا سر جھکائے چلی آ رہی تھیں، کبوتر نے کہا: اے حسین لڑکی تیری نیند میری چیز، تیری لونڈیاں آ رہی ہیں، میں چلا پھر آؤں گا، میں نے تمہارا نام رکھا "قمر بیگم"، اچھا نہیں ہے کہ تیری جیسی خوبصورت شہزادی بنا نام رہ جائے۔

اچانک شہزادی کو یاد آیا کہ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے، چلائی اے گندے پرندے

تجھے میرے ساتھ بات کرنے کا کیا حق تھا؟ میری نیند مجھے لوٹا دے ورنہ تیرا دل اور آنکھیں
باہر نکلوا لوں گی۔ تجھے حق نہیں ہے کہ اپنے اس گندے منہ سے میرا نام رکھے۔
لیکن پھر بہت دیر ہوئی انار کے درخت سے پرواز کر چکا تھا۔ شاہزادی بے کار
غصہ ہو رہی تھی اور اپنے جلادوں کو مدد کے لیے بلا رہی تھی۔

* * *

۴

کئی مہینے ہو گئے تھے کہ شاہزادی ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوئی تھی۔ اس
کی آنکھوں میں نیند کا نام ہی نہ تھا۔ پہلے دنوں میں تو نیند نہ آنے نے اسے ایسا بنا دیا تھا کہ
سب لوگوں نے سمجھا وہ دیوانی ہو گئی ہے۔ کتا کاٹے ہوئے آدمی کی طرح اپنے کمرے
میں جاتی، دیوار اور دروازوں کو نوچتی اور سب کو گالیاں دیتی۔ کسی کو اپنے ساتھ آنے
نہیں دیتی یہاں تک کہ اپنے باپ اور ڈاکٹروں کو بھی۔ دن رات تڑپتی رہتی تھی۔ آخر کار
تھک کر بیمار ہو گئی۔ اب بھی اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ لیکن نہ بات کرتی اور
نہ ہنستی نہ روتی۔ ایک ایک کر کے حکیم اس کے سرہانے آتے دوا علاج بتاتے اور چلے
جاتے۔ کوئی حکیم لڑکی کا علاج نہ کر سکا۔ بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ کسی کو اس کی بیٹی کے
جسم پر ہاتھ رکھنے کا حق نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم لوگ لڑکی کے مرض کا پتہ نہیں لگا سکتے
تھے۔ ایک روز ایک عجیب بوڑھا حکیم آیا اور بولا میں بیمار کو چھوئے بغیر اس کا مرض
معلوم کر سکتا ہوں اور علاج بتا سکتا ہوں۔ اگر اچھا نہیں کر سکا تو میری گردن مار دی جائے۔
بادشاہ نے کہا اسے لڑکی کے سامنے لے جائیں۔ بوڑھے حکیم نے کافی دیر تک لڑکی
کے پاس کھڑے ہو کر اس کا معائنہ کیا اور بولا: اس کا واحد علاج "محبت کا افسانہ"
ہے۔ چاہیے کہ کوئی اس کے سرہانے "محبت کا افسانہ" سنائے تاکہ اچھی ہو جائے
اور سو سکے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ ڈگی پیٹنے والے ملک کے کونے کونے میں نقارہ بجائیں کہ جو
کوئی "محبت کا افسانہ" جانتا ہے آئے اور بادشاہ کی بیٹی کے لیے بیان کرے تاکہ
بادشاہ اس کو انعام سے مالا مال کرے۔
بہت سے مال و انعام کے لالچ میں آئے کہ ہم "افسانۂ محبت" جانتے ہیں

لیکن جب لڑکی کے کمرے کے پردے کے پاس پہنچے تو بہروپ جھوٹے قصے سنانے لیکن
بادشاہزادی پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا اور بادشاہ نے بھی سبھوں کے جلادوں کے سپرد کر دیا۔
دوبارہ کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ دن بیت گئے پھر عجیب و غریب بوڑھا حکیم
ظاہر ہوا اور بادشاہ سے کہا یہ کیسا ملک ہے جہاں کوئی محبت کا افسانہ نہیں جانتا ہے
فلاں پہاڑ میں ایک چرواہا رہتا ہے وہ "افسانہ محبت" جانتا ہے۔ جاؤ اور اسے لے آؤ
لیکن بادشاہ یہ جان لے کہ اگر وہ خود اسے بلانے نہیں جائے گا تو وہ پہاڑ سے نیچے
کبھی نہیں آئے گا۔

حکیم صاحب کہہ کر چلے گئے بادشاہ کچھ لوگوں کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور
روانہ ہو گیا چلتے گئے اور پہاڑ کے دامن میں پہنچے اور جوان چرواہے کو آواز دی چرواہے
نے پہاڑ پر سے پوچھا آپ لوگ کون ہیں؟ مجھ سے کیا کام ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا میں بادشاہ ہوں۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ میری بیٹی مریض ہے
میں چاہتا ہوں تو آ کر اسے علاج کرے۔

بادشاہ کو بھول گیا کہ حکیم نے اس سے کیا کہا تھا چرواہے نے اسے یاد دلایا "افسانہ
محبت" جانتے ہو؟

بادشاہ بولا، ہاں وہی جو تو نے کہا۔ بوڑھے اور عجیب حکیم نے بتایا کہ تم جانتے ہو۔

جوان چرواہے نے بتایا، ہاں میں جانتا ہوں۔

بادشاہ نے کہا اگر میری بیٹی کو اچھا کر دو گے جتنا سونا چاندی اور نقدی چاہو گے
دے دوں گا۔

چرواہا جو پہاڑ سے اتر رہا تھا بولا: بادشاہ، اگر دنیا کے مال و دولت کی بات کرو
گے نہیں آؤں گا "محبت کا افسانہ" صرف محبت کے لیے سنایا جاتا ہے۔

پھر بادشاہ نے کچھ نہیں کہا اس کا دل چاہتا تھا کہ اس چرواہے کو جلادوں کے
حوالے کر دے لیکن کچھ نہ بولا۔ چرواہا بادشاہ کے ترکی گھوڑے پر سوار ہو گیا اور چل
پڑے جب محل کے پاس پہنچے چرواہے کو پردے کے پیچھے بٹھایا اور بولا: یہیں سے
کہو نامحرم کی نگاہ بادشاہزادی پر نہیں پڑنا چاہیے۔

جوان چرواہے نے کہا۔ افسانہ محبت بھی کسی چیز نہیں ہے جو ہر کوئی سن سکے

اگر میرے اور لڑکی کے علاوہ کوئی یہاں آس پاس ہو تو پھر اُس کا اثر نہیں ہوگا سب لوگ دور چلے جائیں۔

مجبوراً بادشاہ نے حکم دیا کہ لڑکی کا محل خالی کر دیں۔ محل میں صرف چرواہا رہ گیا اور لڑکی۔ اُس وقت جوان چرواہے نے پردہ ہٹایا اور کمرہ میں داخل ہوا۔ لڑکی چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی اور کسی چیز یا آدمی کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ چرواہا دروازہ کے کنارے کھڑا ہو گیا اور زور زور سے بولا: اے حسین لڑکی! اے قمر بیگم میں "افسانۂ محبت" سنانا چاہتا ہوں۔ تم سن رہی ہو؟!

لڑکی نے گویا جانی پہچانی آواز سنی اپنا سر گھمایا اور اپنی نگاہیں جوان چرواہے پر گاڑتی ہوئی بولی: ہاں! سن رہی ہوں، سناؤ۔

چرواہے نے کہنا شروع کیا: "محبت کا افسانہ" سنو۔

بہت پہلے کبھی ایک بادشاہ تھا جس کے چھ سات سال کی ایک لڑکی تھی اس لڑکی کی بہت سی نوکرانیاں اور باندیاں تھیں ایک نوکر بھی عمر میں کچھ اس سے بڑا تھا اس کا نام قوچ علی تھا۔ کھاتے وقت اگر لڑکی کا رومال بھی گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر دیتا۔ مثلاً کھیلتے وقت اگر گیند زیادہ دور گر پڑتی تو قوچ علی اُس کے پاس لے آتا۔ کبھی لڑکی گلی ڈنڈا بھی کھیلنا چاہتی تھی۔ اُس کا گلی ڈنڈا بھی سونے چاندی کا تھا۔ جس وقت لڑکی سو جاتی تو قوچ علی کی ڈیوٹی دروازہ پر لگ جاتی تاکہ نوکر چاکر جان جائیں کہ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں اور کچھ نہ پوچھیں نہ بولیں جو حکم بھی شاہزادی دیتی قوچ علی فوراً بجا لاتا اور ایسا اچھا کام کرتا کہ شہزادی نے کبھی اُس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ قوچ علی شاہزادی کا عاشق تھا بالکل سچا اور جانباز اور اسے عزیز رکھتا تھا اس کے خیال میں اس کام میں کوئی برائی نہ تھی۔ آخر کسی کو عزیز رکھنا کون سی خرابی اور پریشانی رکھتا ہوگا؟ جس وقت دونوں باغ میں تھے اور شاہزادی تتلی پکڑتی ہوتی یا گلی ڈنڈا کھیلتی ہوئی ہوتی قوچ علی اپنے آپ کو اتنا خوش اور ہلکا پھلکا محسوس کرتا کہ پوچھو نہیں۔ کبھی اس کو دیکھنے سے سیر نہ ہوتا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ لڑکی اجازت دے کہ اس کا ہاتھ تھام لے اور دونوں ٹہلیں اور تتلی پکڑیں۔ لیکن بادشاہزادی کسی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ نوکروں نوکرانیوں کو کبھی ادھر اپنے پاس نہیں آنے دیتی۔ قوچ علی خوش اور آسان زندگی گزار رہا

تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن دیکھا کہ اپنا راز نہیں چھپا سکتا۔ اسی وجہ سے ایک روز بکری چراتے وقت لڑکی سے کہا، شہزادی صاحبہ میں آپ کا عاشق ہوں، میری آرزو ہے کہ جب ہم دونوں بڑے ہو جائیں تو ہماری شادی ہو جائے۔

بادشاہ کی بیٹی کو یہ بات اتنی بری لگی کہ قوچ علی کو تھپڑ مارا اور بعد میں کتے کی طرح دھتکار کر بھگا دیا۔ بادشاہ زادی نے قوچ علی کو نکال دیا اور یہ کبھی نہ سوچا کہ اس کے سر پر کیا مصیبت آن پڑی۔

جوان چرواہا چپ ہو گیا۔ لڑکی نے کہا: چرواہے، بتا، پھر کیا ہوا؟

چرواہا بولا: اے دختر زیبا، تو سمجھتی ہے کہ قوچ علی پر کیا مصیبت پڑی؟

لڑکی بولی: میں نے کبھی نہیں سوچا ہے کہ قوچ علی پر کیا بیتی؟ تم کو معلوم ہے کہ آخر قوچ علی کا کیا ہوا؟ سامنے آ اور بتا۔

چرواہا اٹھ کھڑا ہوا اور شہزادی کے تخت کے کنارے جا کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور "افسانۂ محبت" کا باقی حصہ اس طرح کہنا شروع کیا:

"قوچ علی کا بابا گزر رہا تھا۔ قوچ علی محل سے نکل کر پیدل صحرا اور جنگل میں چلا گیا اور اپنے بابا کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا بابا سخت بیمار تھا اور بھیڑوں کے باڑے میں سویا ہوا تھا۔ قوچ علی کی بہن جو اسی کی عمر کی تھی بھیڑوں کو چرانے گئی تھی۔ باپ بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا قوچ علی، کیسا موقع پر آیا ہے؟ میں مر رہا ہوں، اپنی بہن کو اکیلا نہ چھوڑ، اکیلا پن مصیبت ہے۔"

بابا مر گیا۔ بیٹے نے اسے اسی پہاڑ پر دفن کیا۔ شام کو جب بہن لوٹی باپ کی جگہ بھائی کو دیکھا۔ دونوں نے مل کر باپ کی موت کا ماتم کیا اور اس کی قبر پر پھول اور سبزہ بو دیا۔

دن، ہفتے، مہینے اور سال بیت گئے۔ قوچ علی اور اس کی بہن سولہ سترہ سال کے ہو گئے۔ دونوں صحرا کا چکر لگاتے رہتے اور اپنے بھیڑوں کو بہترین جگہ چراتے رہتے۔ راتوں کو اپنے کتوں کے ساتھ غاروں میں سوتے۔ صرف کبھی کبھی جاڑوں میں شہر آ جاتے کیونکہ جب برفباری کے زمانے میں بھیڑیں غاروں میں نہ ہوں تو وہ وقت بیکاری کا ہوتا۔

قوچ علی کی بہن بہار کی طرح نرم و نازک تھی اور ہلکی دھوپ کی طرح روشن

تھی۔ پھولوں کی طرح خوشبودار اور پرکشش تھی اور جاڑوں کی راتوں کے چاند کی طرح صاف اور دلچسپ تھی اور جنگلی لالہ کے پھول۔ کی مانند لال اور پیاری تھی۔ سب سے پہلے قوچ علی اسے لالہ کے نام سے پکارتا تھا۔

ایک دن جب وہ اپنی بھیڑیں واپس لا رہے تھے تو قوچ علی نے دیکھا کہ ایک بھیڑ کم ہے۔ کتوں میں سے ایک کتے کو ساتھ لیا اور بھیڑ کی تلاش میں گیا۔ کئی ٹیلے اور چوٹیاں طے کرلیں اور آخرکار دیکھا کہ بھیڑ ایک جگہ بیٹھی ہوئی چشمے کے پاس رو رہی ہے اور بید کی طرح کانپ رہی ہے۔ جب کتے نے بھیڑ کو دیکھا تو بھوں بھوں بھونکا اور کہا بھیڑ رو نہیں ہم آگئے۔

بھیڑ خوش ہوئی اور بولی: مجھے ڈر معلوم ہو رہا تھا کہ اگر تم لوگ مجھے ڈھونڈنے نہیں آئے تو بھیڑیے کا لقمہ بن جاؤں گی۔ میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔

موسم اندھیرا ہونے جا رہا تھا، قوچ علی نے دیکھا کہ پہاڑ کی دوسری طرف سے سات عدد سفید گھوڑے چلے آرہے تھے۔ بھیڑ کو کتے کے حوالے کیا اور انھیں روانہ کرکے خود ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر انتظار کرنے لگا۔ گھوڑے آئے اور چشمے کے کنارے رک گئے۔ سب کی پیٹھ پر پانی کی ایک مشک تھی۔ بھر لیا اور جا کر لوٹیں اتنے میں ایک گھوڑے نے کہا: میں اب اس محل میں تم تنہا بغیر کی نہیں گزار سکتا ہوں میں یہیں یا تو اپنے آپ کو مار ڈالوں گا یا اپنے شہر لوٹ جاؤں گا تم لوگ بھی اپنی چچا زاد بہنوں کے پاس لوٹ جاؤ۔

دوسرے گھوڑوں نے مل کر اسے تسلی دی اور آخرکار لوٹ پڑے۔ قوچ علی بھی گھوڑوں کے پیچھے چل پڑا۔ چلتے گئے اور کئی پہاڑیاں طے کرلیں اور ایک ایسے خاموش جنگل میں پہنچے جہاں کوئی چھوٹے سے چھوٹا پرندہ اور کیڑا اور حیوان نہیں تھا۔ سات خوبصورت محلات نظر آرہے تھے اور ہر گھوڑا ایک ایک محل کے اندر چلا گیا۔ قوچ علی انتظار کرتا رہا اور دیکھا کہ چھ سفید کبوتر آسمان سے نیچے اترے اور ہر ایک ایک ایک محل میں جا نکلا۔ قوچ علی پھر بھی منتظر رہا۔

رونے کی ایک آواز سنی اور ایک محل میں جا نکلا۔ دیکھا کہ ہر محل میں چاند جیسی ایک لڑکی اور سورج جیسا ایک لڑکا بات کر رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ لیکن ساتویں محل

میں ایک سورج جیسا چمکیلا لڑکا اکیلا بیٹھا ہوا چاک کے ایک ٹکڑے سے لالہ کے پھول
کی تصویر بنا رہا ہے اور زار زار رو رہا ہے۔ ایسا روتا کہ پتھر کا دل بھی پانی پانی ہو جاتا تھا۔

فرح علی اندر چلا گیا، سلام کیا اور پوچھا: اے جوان رعنا، میرا دل جلا ڈالا:

جوان نے اپنا سر اٹھایا اور کہا: تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟

فرح علی نے کہا: میں پہاڑ کا چرواہا ہوں۔ تمھارے رونے کی آواز مجھے یہاں
کھینچ لائی۔

جوان بولا: صبح میں نے تجھے پہاڑ پر دیکھا۔ اچھا ہوا تو آ گیا۔ آ اور بیٹھ جا میرا دل کوئی
ساتھی چاہتا تھا۔

فرح علی بیٹھ گیا اور بولا: کیوں اس طرح رو رہا تھا؟

جوان بولا: میرا قصہ تھوڑا لمبا ہے۔ اگر سننے کی تاب رکھتا ہے تو تجھے سناؤں۔

اس وقت اپنی سرگزشت بیان کرنا شروع کیا اور اس طرح کہنے لگا۔

"ہم سات بھائی ہیں۔ دو دن سے زیادہ نہیں ہوا کہ ہم اس جنگل میں آئے ہیں۔
ہم اپنے شہر میں لوہاری کا کام کرتے تھے۔ ہمارا بوڑھا باپ تھا جو شہر کا بہترین تلوار بنانے
والا تھا۔ ہم دن میں لوہاری کرتے اور رات میں چھپ کر تہ خانے کے اندر تلوار بناتے تھے
بادشاہ نے تلوار بنانے پر پابندی لگا دی تھی لیکن چونکہ شہر کے لوگوں کو تلوار کی ضرورت
تھی اس لیے ہم لوگ اس کام کو رات میں کرنے پر مجبور تھے۔ دکان کے اندر دس بیس
شیشے تھے بہت معمولی۔ آٹھ آدمی باری باری دھونکنی چلاتے تھے۔ ایک روز ہمارے
باپ نے ہم سے کہا: میرا مرنے کا وقت آ پہنچا ہے لیکن ابھی بڑی لمبی عمروں تک جیو
گے اور تمھیں زندگی میں کسی ساتھی کی ضرورت ہوگی۔ تمھاری شادی کی عمر بھی ہو گئی ہے۔
تمھارے لیے ایسی بیویوں کی ضرورت ہے جو تمھاری طرح انگیٹھی اور چرخ چلائیں، دھونکنی
چلائیں اور تلواریں بنائیں۔ تمھارے چچا کی بیٹیاں ایسی بیویاں بن سکتی ہیں لیکن اس لیے
کہ تم لوگ بھی اپنی قابلیت کا نشان دے سکو۔ میں نے اور تمھارے چچا مرحوم نے ایک
امتحان لینا طے کیا ہے۔ تمھاری چچا زاد بہنوں کی نشانیاں ہم نے انھیں شیشوں کے اندر
چھپا رکھی ہیں۔ تمھیں چاہیے کہ ایسی تیز تلوار بناؤ کہ ایک وار میں ہی شیشے کے دو ٹکڑے
کر دے تاکہ تمھارے چچا کی بیٹیوں کی نشانی اس میں سے باہر نکل پڑے۔

کچھ دنوں بعد ہمارے بابا کا انتقال ہو گیا۔ ہم ساتوں بھائی کام میں لگ گئے۔ زیادہ تر وقت ہم کارخانے میں چپ چاپ کرتے رہے، فولاد اور ہتھوڑے اور دوسری چیزوں میں الجھے رہتے لیکن ہم جو تلوار بھی بناتے وہ شیشے پر اثر نہیں کرتی اور خود دو ٹکڑے ہو جاتی۔ آخر ایک جاڑے کی سرد اور اندھیری رات میں ہمارے ہاتھوں ایک ایسی تلوار تیار ہو گئی جس نے شیشے کو کاٹ دیا۔ شیشے کے دل میں سے ایک ڈبیہ برآمد ہوئی۔ اس کے اندر کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "ہمارے چچا کے شمشیر ساز بیٹو! تمھاری تلوار کی تیزی کے قربان، جس قدر جلد ہو سکے ہماری تلاش میں آؤ۔ ہمارے دل تمھارے لیے بے چین ہیں۔ ہم نے برہوت کے جنگل میں پیڑ اگائے ہیں اور گھنا جنگل صاف ستھرا کر کے تمھارے انتظار میں ہیں۔ ہمارا پتہ پہاڑ کے سرخ لالہ کے پھول سے پوچھنا۔ تمھاری چچا زاد بہنیں۔"

اس رقعے نے ہم کو ایسا بیقرار کیا کہ بس نہ پوچھو۔ ہم چاہتے تھے اسی رات روانہ ہو جائیں اور لڑکیوں کے پاس پہنچ جائیں لیکن ہم نہ تو ان کا پتہ جانتے تھے اور نہ ہم اپنا کام چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ شہر کے فوجیوں نے اسی روز ہمیں ہزار تلوار بنانے کا آرڈر دیا تھا کہ ہم جاڑا ختم ہونے سے پہلے اسے پورا کر دیں۔ بدقسمتی سے جاڑا لمبا ہو گیا اور بہار دیر میں آئی اور ہم روز بروز زیادہ بیقرار ہوتے گئے۔ ابھی برف پگھلی ہی تھی کہ ایک ٹیلے پر ہم نے انتہائی شاداب اور تر و تازہ لالہ پھولا ہوا دیکھا جس کے سینے میں ایک خوبصورت کالا داغ تھا۔ ہم نے لالہ سے پوچھا۔ لالہ کے پھول، ہمارے چچا کی بیٹیاں کہاں ہیں؟ ان کا پتہ بتاؤ۔

لالہ کھڑا ہو گیا اور مجھ سے بولا، چچا کے بیٹے مجھے چوم لو میں بتاتا ہوں۔

میں جھک گیا اور لالہ کے پھول کو چوم لیا۔ اسی وقت لالہ بولا، اس سال سخت جاڑا تھا اور بہار دیر میں آئی۔ چچا کی بیٹیاں پریشان اور منتظر ہیں۔ ایسی بیقرار ہیں کہ اگر تم لوگ ان کی مدد کو نہیں پہنچو گے تو ممکن ہے کہ وہ سب اپنے آپ کو مار ڈالیں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کس طرح کبھی کبوتر کی شکل بن جاؤ اور کبھی گھوڑے کے لباس میں ہو جاؤ تا کہ ان تک جلد پہنچ جاؤ۔

پھر لالہ کے پھول نے لڑکیوں کی نشانی بتائی اور پھر ہمیں سکھایا کہ کیسے کبھی کبوتر بن جائیں اور کبھی گھوڑے۔ اس کی آخری بات مجھ سے تھی، کہا، چچا زاد بھائی، میرا

دل بہت چاہتا ہے کہ تم مجھے توڑ لو اور اپنے پاس رکھو لیکن میں کیا کروں کہ جتنے بھی لالہ کے بیج تھے سب سردی نے جلا دیے اور اگر میں بھی نہ رہ جاؤں تو پھر ان ٹیلوں پر کوئی سرخ لباس نہیں پہنا سکے گا۔ میں چاہتا ہوں مجھے نہ توڑو تاکہ میں ہر جگہ بیج چھڑکا دوں اور ٹیلوں کو پھر سے لالہ کے سرخ پھولوں سے بھر دوں۔

ہم لالہ سے جدا ہو گئے۔ تلواریں بنا کر دے دیں اور کبوتر کا بھیس بدل کر چل پڑے پھر ہم اڑتے اڑتے تھک گئے اور گھوڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ ہم سمندر، صحرا اور پہاڑ پار کر گئے اور آخر کار کل شام اسی تنہا اور خاموش جنگل میں پہنچے۔ ہم نے محلوں کو دیکھا جن میں کوئی تخت بچھائے گئے تھے ہم بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ رات میں چند سپید کبوتر جنگل کی جستجو سے ظاہر ہوئے ہمیں دیکھا اور خوش ہوئے۔ اڑ کر نیچے آئے، کبوتروں کا بھیس اتار دیا اور چند چاند سی لڑکیاں بن گئیں۔ بولیں: چچا کے بیٹو خوش آمدید!

پھر میری طرف دیکھا اور بولیں: چھوٹے چچازاد بھائی! تم بھی اچھے آئے ہو، ہماری چھوٹی بہن لالہ نے کہا ہے کہ تم صبر کرو، آخر اس سال جاڑا شدید اور لمبا تھا اور جہاں کہیں لالہ کا بیج تھا سردی نے سکھا دیا اگر لالہ یہ کام نہ کرتی، تم لوگ ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیتے کیونکہ اب کوئی اور بیج نہ تھا کہ پھول کھلائے اور بہار اپنے تئیں بتائے۔ اگر ہماری بہن لالہ اپنا خون زمین پر نہیں بہاتی تو زمین زندگی بھر کے لیے لالہ کو بھول جاتی اور پھر لوگ بھی لالہ کا پھول کبھی نہ دیکھ پاتے۔

اتنا یاد کر کے میں ایسا ہو گیا گویا میں پاگل ہو جاؤں گا اور چیخ اٹھا: تو کیا ٹیلے پر کھلا ہوا سرخ لالہ میرا اپنا پھول تھا؟

بہنوں نے کہا: ہاں وہ ٹیلے والا لالہ کا لال پھول ہماری چھوٹی بہن تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ یقین کریں کہ صحرا میں لالہ کا کوئی پھول باقی نہیں رہ گیا وہ چاہتی تھی کہ ٹیلے پھر لالہ زار بن جائیں، سرخ ہو جائیں۔ ہاں، ہاں۔ اس کی محبت ہم تمام لوگوں سے زیادہ تھی اس نے خود کو زمین اور ہم لوگوں کے لیے قربان کر دیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ لوٹ جاؤں اور لالہ کا پھول توڑ لاؤں، لیکن لالہ کی قربانی اتنی بڑی تھی کہ میں چپ ہو گیا۔ چچازاد بہنیں مجھے لالہ کے محل میں لے گئیں جو خالی پڑا تھا۔ کل رات ہم سب، سب لالہ کے محل میں تھے اسی محل میں چچازاد

بہنوں نے مجھے بتایا کہ لالہ مجھے بہت چاہتی تھی اور بہت شدید محنت کرتی تھی۔ جنگل
کے پیڑوں کے لیے پہاڑی چشمے سے پانی لاتی تھی۔ چچا کی بیٹیوں نے بتایا کہ ایک زمانہ
ہو گیا ہے کہ جانوروں نے شاہی شکارگاہ میں پروپگنڈا کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ سب
ان کے جنگلوں کو چلے آئیں۔ جانوروں نے بھی منظور کر لیا ہے۔ وہ لوگ ہم لوگوں کی شادی
میں شرکت کریں گے۔ لیکن ہمارے بھائی اور بہنوں نے میرے لیے اپنی شادیاں ٹال
دی ہیں۔ مجھے بھی شہر لوٹنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ آج پھر اکیلا تھا اور اداس
ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں
کہ تم نے میرا درد دل سنا۔

* * *

جب جوان نے اپنی رام کہانی سنائی تو قوچ علی نے کہا: تم کو رونے کا حق ہے۔
میں بھی ایک بار ایک شاہزادی کا عاشق ہوا تھا لیکن اس نے مجھے اپنے محل سے نکال
دیا اور میں پھر لوٹ کر نہ گیا۔
جوان نے پوچھا: کیا تم اس سے روٹھ گئے ہو؟
قوچ علی نے کہا: نہیں۔ اگر میں اب بھی اسے دیکھوں تو پھر بھی اس کا عاشق ہو جاؤں
گا۔ ایسی خوبصورت ہے کہ مثال نہیں رکھتی ہے۔ لیکن اس کے اخلاق و عادات بڑے
ہیں اور بڑی مغرور ہے۔ میں تمہاری لالہ کے ایک بال کو بادشاہزادی جیسی ہزار لڑکیوں
کے عوض نہ دوں۔
پھر جوان نے کہا: قوچ علی، بس تم اکیلے زندگی گزار رہے ہو؟
قوچ علی نے کہا: نہیں میں اپنی بہن لالہ کے ساتھ رہتا ہوں۔
جوان بولا: کیا کہا، لالہ؟ وہی لڑکی جو تمہارے ساتھ بھیڑیں چراتی ہے؟
قوچ علی نے کہا: ہاں۔ وہی سرخ چہرے والی جنگلی لڑکی، وہ میری بہن ہے۔
جوان اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور بولا: قوچ علی، میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا
ہوں لیکن ڈرتا ہوں۔ تجھے بری لگے گی۔
قوچ علی نے کہا: میں جانتا ہوں، تم میری بہن کے بارے میں کہہ رہے ہو۔ ٹھیک
ہے، چلو ہم ابھی چلتے ہیں۔ اگر وہ راضی ہو گئی تو ابھی لوا آئے۔ میں بھیڑوں کو اکیلے میں

میں جا سکتا ہوں۔
اس وقت جوان نے بتایا کہ کس طرح کبوتر اور گھوڑا بن جایا جاتا ہے۔

* * *

غار میں لالہ بیٹھی ہوئی ایک ایک بھیڑ کے بال میں کنگھا کر رہی تھی۔ جب بھی اسے نیند آتی اور اکیلی ہوتی تو اس کام میں مشغول رہتی۔ بھیڑیں اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں اور لالہ کی کہانی سن رہی تھیں۔ کچھ بھیڑیں سن بھی رہی تھیں اور سو بھی رہی تھیں یا جگالی کر رہی تھیں۔ کتے بھی غار کے دروازے پر لیٹے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ آدھی رات کا چاند غار کے اوپر جھکا ہوا تھا اور پورے غار کو روشن کر کے اسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چاند نے لالہ سے کہا، لالہ اٹھو اور آگ جلاؤ۔ میں اب اس سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکتا ہوں، میں جا رہا ہوں۔

لالہ چل کر گئی اور غار کے منہ پر جا کر آگ جلائی۔ چاند آہستہ سے غار کے منہ پر سے کھسک گیا اور چل دیا۔ یہ واقعہ ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ دو عدد کبوتر غار میں داخل ہوئے۔ ایک بالکل سفید اور دوسرا سفید مگر سینہ میں سرخ نشان دار۔ لالہ نے پوچھا، جانورو کیا راستہ بھول گئے ہو؟ آؤ میرے پاس۔

سفید کبوتر نے لال نشان والے کبوتر کی طرف دیکھا اور گویا یہ کہا: جاؤ اس کے سامنے ڈرو نہیں۔ لال نشان والا کبوتر گیا اور لالہ کے ہاتھ پر بیٹھ گیا اور اس کے پیچھے دوسرا کبوتر بھی آیا اور لالہ کے دامن میں بیٹھ گیا۔ پھر لالہ نے دونوں کو زمین پر رکھ دیا اور بولی: یہیں رہو میں جاؤں تم دونوں کے لیے دانہ لے آؤں۔

پھر غار کے اندر گئی۔ ایک پتھر ہٹایا تو اندر سوراخ تھا اور پھر ایک چھوٹا غار نظر آیا۔ اندر گئی۔ کبوتر جلدی سے اپنا بھیس بدل کر اصلی روپ میں آ گئے۔ کتے قوچ علی کو دیکھ کر آئے اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ لالہ دونوں مٹھیوں میں گیہوں بھرے ہوئے لوٹی۔ دیکھا کہ اس کا بھیا غار میں ایک لمبے تڑنگے خوبصورت جوان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور کبوتر غائب ہیں۔ پوچھا، قوچ علی تم کہاں گئے تھے، بڑی دیر لگا دی!

قوچ علی نے کہا، اچھا یہاں آؤ اور میرے نئے دوست سے ملو۔ پھر بتاؤں گا میرا یہ دوست یہاں تک تیری تلاش میں آیا ہے۔

لالہ پہلے تو چپ ہوگئی۔ پھر بولی: میرے کبوتروں کو نہیں دیکھا کہاں چلے گئے؟

قوچ علی نے کہا: ہم جب اندر آئے، پر پھڑپھڑائے اور باہر اڑ گئے۔ میں جا کر ان کو ڈھونڈتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں جا سکتے ہیں۔ تم دونوں بیٹھ کر اپنی اپنی باتیں کرو۔

قوچ علی یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ ایک چٹان پر صحرا کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ اُس کا دوست اور لالہ ہاتھوں میں ہاتھ دیے چلے آ رہے ہیں۔ وہ بولا: مبارک ہو۔

جوان بولا: میرے دوست! اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ ابھی ابھی میں لالہ کے ساتھ جنگل کو لوٹ جاؤں تاکہ میری چچازاد بہنیں اور میرے بھائی پریشان نہ ہوں۔

قوچ علی نے مسکراتے ہوئے لالہ سے کہا: لالہ، اپنے کبوتروں کو نہیں چاہتی ہے کہ پکڑ کر لاؤں؟

لالہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: بس کرو، قوچ علی۔ مجھے خوب بہکایا۔ آج تو تیرا مذاق حد سے گزر گیا۔

پھر تینوں ہنسے۔ جوان نے قوچ علی سے: کل شام ہم تمھارے منتظر ہوں گے۔ جنگل میں ہماری شادی میں آنا۔

پھر وہ ایک سفید سفید گھوڑے کے روپ میں آ گیا۔ لالہ کو پیٹھ پر بٹھایا اور روانہ ہو گیا۔ قوچ علی صبح مرغے کی ککڑوں کوں کی آواز تک چٹان پر بیٹھا ہوا جاگ کرتا رہا۔ پھر اٹھا اور جا کر بھیڑوں کے ریوڑ کے پاس جا کر سو گیا۔

• • •

دوسری رات جنگل میں بڑا شور شرابہ تھا۔ آسمان و زمین کے چاروں طرف سے پرندے، حیوان اور بلوں میں رہنے والے کیڑے مکوڑے آ آ کر پیڑوں، جھاڑیوں اور سوراخوں کے پاس اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے۔

ساتوں بہادر بھائی اپنی اپنی جوان اور خوبصورت دلہنوں کے ساتھ ایک بڑی میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی شادی کی رات کا ولیمہ کھا رہے تھے

قوچ علی بھی تھا۔ یہ طے کر لیا تھا کہ آدھی رات کو دولہا اور دلہن جنگلی جانوروں کے حوالے کر دیں گے اور شہر لوٹ جائیں گے۔ چاہتے تھے کہ قوچ علی کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں مگر وہ دبا تا اور بولا: مجھے اپنی بھیڑ بکریوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔

آدھی رات گئے ساتوں دولہاؤں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور کبوتروں کا روپ بدل کر اڑ گئے۔ قوچ علی تھوڑا جنگل میں گھوما پھرا لیکن اپنے اکیلے پن کا دکھ دبا نہ سکا۔ آخر کار ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر بہت دیر تک روتا رہا۔ جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ تو غار میں اپنے ریوڑ کے پاس آ گیا۔

جوان چرواہا پھر رک گیا اور اپنی آنکھیں لڑکی کی آنکھوں کی طرف گاڑ دیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کہانی کا اثر لڑکی کی آنکھوں میں دیکھے۔ لڑکی نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا: آگے اور بھی سناؤ۔ بتاؤ کہ قوچ علی کا کیا ہوا۔ چرواہا بولا:

اس دن کے بعد کی دوسری رات تھی کہ قوچ علی کو بادشاہزادی کی دوبارہ یاد آئی اور سمجھا کہ آج بھی اسے دل سے چاہتا ہے۔ اپنے آپ سے کہا میں جنگل کا چرواہا نہیں اگر اس کا دماغ نہ ٹھیک کر دوں۔ آدمی بنا دوں گا۔ میں جانتا ہوں اس کے ساتھ کیا ترکیب کی جائے کہ بادشاہزادی اپنے جنگلی پن کو چھوڑ دے۔ پہلے تو یہ چاہیے کہ اسے اس قسم کی زندگی سے دور کیا جائے۔

اسی وقت وہ کبوتر کا روپ دھار کر شاہزادی کے باغ میں پہنچا۔ اتنی دیر انتظار کیا کہ شاہزادی آئی اور دودھ کے تالاب میں نہانے کے لیے داخل ہوئی۔ قوچ علی بھی آیا اور انار کے پیڑ پر بیٹھ گیا اور بولا: اے حسین لڑکی تیرا جسم کتنا خوبصورت ہے میں تیرا عاشق ہوا۔ میری آرزو ہے کہ تو دودھ کے تالاب سے باہر آ تا کہ میں تجھے دیکھوں بادشاہزادی پہلے تو آنکھ کانٹے جیسے آدمی کی طرح غرغر کرنے لگی۔ گالیاں بکیں اور حکم دیا لیکن وہ پھر بھول گئی کہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور باقی لڑکیوں کی طرح مہربان ہو گئی اور بولی: اے اچھے دوست کبوتر! میں چاہتی ہوں کہ تو مجھے نہ دیکھ اچھا نہیں ہے۔

قوچ علی بولا: یہ میرے بس میں نہیں ہے شاہزادی کہ تمہیں نہ دیکھوں۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔

لڑکی نے کہا: اے اچھی باتیں کرنے والے کبوتر میں ایک کبوتر کی دوستی کیسے قبول کر سکتی ہوں؟ اگر تو واقعتاً سچا سچا عاشق ہے تو اپنا روپ دھار لے اور اصل بن جا تاکہ میں تجھے دیکھوں۔

قوچ علی اپنے اصل لباس میں نہیں آیا۔ شاہزادی کا راضی ہو گئی کہ اپنی نیند قوچ علی کو عطا کر دے تاکہ وہ کبوتر کے روپ سے باہر آ جائے۔ قوچ علی نے لڑکی کی نیند چرا لی اور اڑ کر چلا گیا۔ اس روز کے بعد لڑکی کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی۔ اتنا جاگی کہ مریض ہو کر بستر پر پڑ گئی۔ شہر کے حکیم اس کی بیماری کا علاج نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ کوئی اس کی بیٹی کو ہاتھ نہ لگائے۔ ایک دن قوچ علی نے اپنے آپ کو ایک بوڑھے حکیم کے بھیس میں ظاہر کیا۔ بادشاہ کے پاس گیا پھر لڑکی کے پاس گیا کہ بغیر ہاتھ لگائے اس کا علاج کرے۔ تھوڑی دیر تک لڑکی کو دیکھتا رہا گویا اس کا معائنہ کر رہا ہو، پھر بتایا کہ اگر لڑکی کو "افسانۂ محبت" سنایا جائے تو وہ اچھی ہو جائے گی۔ کوئی آدمی شہر میں "افسانۂ محبت" سے واقف نہ تھا۔ قوچ علی دوبارہ بوڑھے اور اجنبی شخص کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور بادشاہ کو بتایا کہ فلاں پہاڑ میں ایک جوان چرواہا زندگی بسر کر رہا ہے اور "افسانۂ محبت" اچھی طرح جانتا ہے اور بادشاہ خود اس کی تلاش میں جائے تو وہ لڑکی کے سرہانے آئے گا۔"

جوان چرواہا پھر خاموش ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ہنسا اور بولا: ہاں اے خوبصورت لڑکی! اے قیز خاتون ایسا ہوا کہ تیرے باپ نے جس نے مجھے کتے کی طرح اپنے محل سے باہر کر دیا تھا، وہ پہاڑوں میں آیا اور مجھے تمہارے سامنے لایا۔ اب کیا کہتی ہو؟

قیز خاتون اپنا رونا نہ روک سکی۔ بولی، قوچ علی میں اب ہمیشہ کی طرح بھول گئی کہ میں بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ میں تمہیں چاہتی ہوں، اب میں سمجھتی ہوں کہ مجھے تیری محبت کی کس قدر ضرورت ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو میں چاہتی ہوں کہ عام لوگوں کی طرح زندگی گزاروں۔

قوچ علی نے کہا تمہارے لیے آسان نہیں ہے کہ سب کی طرح زندگی گزارو۔

کیونکہ تم اوڈیار سے پلی بڑھی ہو، لیکن اگر تم خود چاہتی ہو تو یقیناً تم زندگی کی عادت ڈال لو گی۔

تیز خاتون بولی، اگر میں تمھارے اور دوسرے دل کے ساتھ رہوں گی تو یہ کام میرے لیے آسان ہے۔ قوچ علی، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تیز خاتون کو اکیلے نہ چھوڑو۔

قوچ علی نے اس کے آنسو پونچھے اور اپنی جیب سے ایک سیب باہر نکالا اور کہا: ابھی تم تھک گئی ہو۔ لو اس سیب کو میرے ہاتھوں سے کھاؤ، پھر میں تمھاری تلاش میں جاؤں گا۔ اب تو مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا دوست سمجھے گی۔ مجھے معلوم ہے۔

خوبصورت لڑکی نے سیب لیا اور کھایا اور لیٹ گئی، پھر اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں اور میٹھی نیند میں ڈوب گئی۔

قوچ علی کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کے بال چومے اور باہر چلا گیا اور بادشاہ سے بولا: تمھاری بیٹی کئی ہفتوں سے سفر سے تھکی ہوئی ہے۔ کئی روز تک کوئی اس کے محل کے اردگرد نہ جائے کیونکہ وہ جاگ پڑے گی۔ جو تھکے رہو، جاگ کر اسے جگا دو۔

## ۵

دوسرے دن صبح، ابھی سورج بھی نہیں نکلا تھا کہ قوچ علی کبوتر کے بھیس میں تیز خاتون کے پاس آیا، اپنا روپ بدلا اور لڑکی کے سر کے پاس ایک لال پھول رکھا۔ لڑکی جاگ پڑی اور آنکھیں کھول دیں اور دھیمی ہنسی ہنسی۔

قوچ علی نے کہا: آرام سے سوئیں؟

تیز خاتون نے کہا: ہاں، گہری نیند سوئی جیسے شکر اور شہد۔ اب تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟

قوچ علی نے کہا: ہاں، چلو باغ میں چلیں، تم ہاتھ منہ دھو لو پھر ہم لوٹ چلیں گے۔

. . .

ابھی سورج نکلا بھی نہ تھا کہ دو سفید کبوتر تالاب کے کنارے والے انار کے پیڑ پر سے اڑے اور آسمان میں غائب ہو گئے۔

تمام

تمت تمام شد
کاتب نظام شد

۹ مارچ سنہ ۱۹۸۱ء

Price : Rs. 29 .00